66

سہ ماہی

کاروان ادب

جلد نمبر-۲۴ | اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۷ء | شمارہ نمبر-۳

مجلس مشاورت

● مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی ● مولانا حافظ فضل الرحیم ● ڈاکٹر محمود الحسن عارف ● مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر مسئول

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

مدیر معاون ڈاکٹر تابش مہدی

مجلس ادارت

● مولانا نذر الحفیظ ندوی، لکھنؤ ● ڈاکٹر سید ضیاء الحسن، لکھنؤ ● ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی ● مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپئے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰/روپے یا ۱۰/امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰/روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 94[illegible]786

فہرست

پیغام	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
(اداریہ) ادبی اظہار اور علماء کرام	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۶
مناجات	مقبول الٰہی	۹
حمد باری تعالیٰ	علیم ناصری	۱۱
نعتیں	حافظ لدھیانوی	۱۲
قرآن کا ادبی اعجاز	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۳
قرآن مجید میں ہدایتی اسلوب اور حسنِ تعبیر و بلاغت کا امتزاج	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۱۸
قرآن مجید کا اعجاز بیانی اور قرآنی اسلوب.....	مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی	۲۹
امثالِ قرآنی کی بلاغت و معنویت	مولانا عبدالمصور خاں ندوی	۳۵
قرآنی اسلوبِ ہدایت قصص و حکایات کے تناظر میں	مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی	۳۷
قرآنِ مجید کا ناصحانہ اسلوب (چند تمثیلات کی روشنی میں)	ڈاکٹر عبدالرشید ندوی مدنی	۴۳
اسلوبِ قرآنی وارشادِ رحمانی	مولانا اقبال احمد ندوی	۴۸
رباعیاتِ امجد میں روحانی تجربے	پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی	۵۵
غزل	شہزاد احمد	۶۵
غزل	شہزاد احمد	۶۶
غزل	سعود عثمانی	۶۷
غزل	مرغوب حسین طاہر	۶۷
ارتضیٰ نشاط		۶۷
زندگی عزیز ہے (افسانہ)	سلطان جمیل نسیم	۶۸
لہو پکارے (افسانہ)	شبیب احمد کاف	۷۶

پیغام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ادب کی اصطلاح اپنے بنیادی معنی کے اعتبار سے سلیقہ مندی اور تہذیب کی ہے۔ اس معنی کا عکس کلامِ انسانی کے طرز پر بھی پڑتا ہے اور اس سے کیفیت کی ادائیگی بھی ہوتی ہے، جس سے اثر پذیری اور پسندیدگی کی شکل بنتی ہے اور انسان کے اندرونی تاثر کو پُر اثر پیرایے میں ادا کرنے کا عمل انجام پاتا ہے۔ کلامِ انسانی میں انسان کے خالق و مالک نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ صرف خبر دینے اور سادہ بیانی کا عمل ہی نہیں، بلکہ ادا کیے جانے والے معانی کے پیچھے انسانی نفسیات کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح صاحبِ کلام کی جو اندرونی کیفیت ہوتی ہے اس کی خاصی جھلک اس کے کلام میں آجاتی ہے۔ اور انسان انسان میں الگ الگ اور موقع کے فرق سے جو تاثر ہوتا ہے اس کو دوسرے محسوس کر لیتے ہیں بشرطیکہ اپنی بات کو ادا کرنے والے الفاظ الفاظ میں کیفیت کا جو فرق ہے، اس کو معلوم ہو اور وہ اس کی رعایت کرتے ہوئے کلام کو پیش کرے۔ اس سے کلام کبھی صرف سادہ کلام ہوتا ہے اور کبھی وہ ادب ہو جاتا ہے۔ صاحبِ کلام جس نفسیاتی کیفیت کا ہوتا ہے اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں صاحبِ کلام کے جیسے حالات ہوتے ہیں ایسے ہی نمایاں ہوتے ہیں، اور یہ بات آورد سے زیادہ آمد میں ہوتی ہے، اس میں طبعی سطح پر تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اور سامع اور قاری اس سے متاثر ہوتا ہے۔

ادبِ اسلامی کی خصوصیات سمجھنے کے لیے ہم کو کلامِ الٰہی کی آیات سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآنی بلاغت سے زیادہ فیض ملا تھا، لہٰذا آپ کے کلام میں اس کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں، خاص طور پر جہاں آپ نے کسی تاثر سے بات فرمائی ہے، مثلاً آپ کی دعائیں اور بعض پُر اثر موقعوں پر آپ کا اظہارِ تاثر اور دعا، جیسا کہ طائف کی دعا اور عرفات کی دعا بڑی بلاغت کی حامل نظر آتی ہے۔ اور خطاب کی صورت میں

غزوۂ حنین کے بعد کا ایک خطاب، فتحِ مکہ کے موقع پر جبکہ مقدس اور مرکزی شہر بلا جنگ کے فتح ہوگیا اور وہاں کے قائدین جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار ہونے کے باوجود آپ کو ختم کردینے کے لیے تیرہ سال مکہ کے قیام میں اور دس سال مدینہ کے قیام میں کوشش کرتے رہے تھے اور مدینہ منورہ کے قیام میں فوج کے ذریعے آپ کو اور آپ کے پیغام کو ختم کردینے کے لیے جنگیں کرتے رہے تھے، اب مکہ فتح ہونے پر بے بس ہوکر تابع بن جانے پر مجبور ہوئے ، اس کے متصلا بعد حنین کی جنگ ہوئی اور اس میں آپ کو فتح ہوئی اور بہت مال غنیمت بھی ملا وہ سب آپ نے اپنے اعزہ میں تقسیم کردیا تاکہ وہ پوری طرح اسلام کے تابعدار ہوجائیں اور اس سے قبل کی جنگوں میں مالِ غنیمت حضراتِ انصار کو خاصا دیا کرتے تھے، وہ اب اس موقع پر نہ ہوا، اس کو انصار نے یہ محسوس کیا کہ آپ کو وطن میں پریشان ہوکر وطن مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جانا پڑا تھا، وہاں انصار سے تعاون ملتا رہا۔ اب جب وطن حاصل ہوگیا تو شاید واپس جانے کا ارادہ ہو، لہٰذا وہاں کے لوگوں میں بھرپور طریقے سے مال تقسیم کیا ہے اور اب شاید انصار کو چھوڑ دیں۔ اس تناظر میں کچھ خیال ابھرا، آپ کو جب اس کا علم ہوا تو آپ نے انصار کو جمع کرکے صورتِ حال سے مطلع کیا اور اسلام کی مصلحت بتائی اور ایسے موثر انداز میں بات کہی کہ سب متاثر ہوکر رونے لگے۔ اس خطاب کا ترجمہ دیکھیے ، فرماتے ہیں:

''اے حضراتِ انصار! یہ کیا باتیں ہیں؟ جو آپ لوگوں کی نسبت سے مجھ تک پہونچی ہیں، اور وہ کیا احساس ہے جو آپ لوگوں نے اپنے دلوں میں محسوس کیا ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ میں آپ لوگوں کے پاس آیا، اور حالت یہ تھی کہ آپ سب لوگ راستے سے بھٹکے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے تعلق سے آپ لوگوں کو راستہ دکھلایا اور آپ لوگ مالی تقویت کے معاملے میں دوسروں کے دست نگر تھے، اللہ تعالیٰ نے میرے تعلق سے آپ لوگوں کی یہ محتاجی ختم کی۔ اور آپ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے، اللہ نے آپ کے دلوں میں آپس کی الفت پیدا کی۔ یہ سن کر حضراتِ انصار نے کہا کہ واقعی اللہ اور اس کے رسول ہی کا کرم اور احسان ہے۔ پھر آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ اے انصاری بھائیو! اس کے جواب میں تم کیا کہتے ہو، انھوں نے کہا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہم آپ کو کیا جواب دے سکتے ہیں، احسان وکرم سب اللہ اور اس کے رسول ہی کا ہے۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: بخدا تم اگر چاہو تو یہ کہہ سکتے ہو اور یہ کہو گے تو سچ کہو گے اور میں تمہاری تصدیق

کروں گا، وہ یہ کہ آپ ہمارے پاس اس حالت میں آئے تھے کہ آپ کو جھٹلایا جاچکا تھا، اس وقت ہم نے آپ کی تصدیق کی، لوگوں نے آپ کو چھوڑ دیا تھا، اس وقت ہم نے آپ کی مدد کی، اور آپ اپنی جگہ سے نکالے ہوئے تھے، ہم نے آپ کو جگہ دی، اور آپ دوسروں کے سہارے کے محتاج تھے، ہم نے آپ کے ساتھ ہمدردی کی، پھر آپ نے فرمایا: اے انصار بھائیو! کیا تمہارے دلوں میں میرے متعلق شکایت پیدا ہوئی اور یہ شکایت دنیا کی کچھ تھوڑی سی مزیدار چیز کے سلسلے میں ہوئی کہ جس کو دے کر میں نے کچھ لوگوں کو مانوس کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کا اسلام مضبوط ہوجائے، اور تم کو میں نے تمہارے اسلام کے سپرد کردیا، اے انصار بھائیو! کیا تم اس پر راضی اور خوش نہیں ہو کہ دیگر لوگ یہاں سے بکریاں اور اونٹ لے لے کر لوٹیں اور تم اللہ کے رسول کو لے کر اپنے گھروں کو لوٹو۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے، تم جو لے کر لوٹو گے وہ اس سے بہتر ہے جس کو لے کر یہ لوگ لوٹیں گے، میں تو اگر ہجرت کا عمل نہ ہوتا تو انصار ہی کے اندر کا شخص ہوتا اور میرا طرز عمل تو یہ ہے کہ لوگ کسی ایک گھاٹی یا وادی میں چلیں اور انصار کسی دوسری گھاٹی اور وادی میں چلیں تو میں انصار ہی والی گھاٹی اور وادی میں چلوں گا، انصار تو میری نظر میں شعار ہیں (یعنی اس لباس کی طرح ہیں جو ہر وقت جسم سے لگا رہتا ہے)، اور دیگر لوگ اوپری کپڑوں کی طرح ہیں (یعنی ایسے کپڑے جن کی ضرورت ہر وقت نہیں پڑتی)۔'' اور پھر فرمایا: اے اللہ! انصار پر رحم فرما، انصار کی اولاد پر رحم فرما۔

آپ کے اس خطاب کی اثر انگیزی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ادبی تاثیر آپ کے کلام میں کتنی زیادہ تھی ۔کلام کی ترتیب میں انصار کی نفسیاتی کیفیت کا کتنا لحاظ تھا کہ پہلے تو ان کے ایمانی جذبے کو مخاطب کیا کہ ایمانی جذبہ اور دنیاوی مال دونوں کا فرق پیش نظر رکھا، پھر ان کے دلوں میں جو کسک تھی اس کو جانتے ہوئے اس کا تذکرہ کیا اور تسلیم کیا، پھر اپنے اظہار تعلق ومحبت کے حوالے سے اس کسک کو دور کیا، کیسی اثر پذیر بلاغت کی بات کی اور اس کا اصل زور اس کی عربی عبارت میں ہے جو ترجمہ کے زور سے زیادہ ہے۔ ہمارا ادب اسلامی اپنے لیے ایسے ہی ادب کو رہنما سمجھتا ہے اور اسی جادہ پر چلنا پسند کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

☆☆

(اداریہ)

ادبی اظہار اور علماء کرام

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

عام روزمرہ کی گفتگو میں اور ادبی اظہار میں وہی فرق ہے جو روزمرہ کے سادہ کھانے میں اور اس دسترخوان میں ہے جس میں کام ودہن کی عیش افزوں اور نشاط افزا لذت کا سامان ہوتا ہے۔ زبان کو اس حسن وخوبی کے ساتھ استعمال کرنا کہ مضمون سامع یا قاری کے دل میں تیر نیم کش کی طرح پیوست ہو جائے ،اور وجد وسرور اور انبساط کی کیفیت پیدا کردے ادب کہلاتا ہے۔ادب کے لیے موضوع کی تحدید نہیں ہے، قرآن مجید ادب کا بے نظیر شاہکار ہے،لیکن اس کا موضوع انسانیت کی صلاح وفلاح ہے اور اس کا مقصد عبد کو معبود سے جوڑ دینا ہے۔ یہ تصور بالکل غلط ہے کہ ادب کے بعض خاص موضوعات ہیں، شاعری ، افسانہ نگاری اور تنقید وغیرہ پر لکھنے سے آدمی ادیب بن جاتا ہے۔ ہر آدمی محمد حسین آزاد نہیں ہوتا کہ ان کی لکھی ہوئی کتاب ''آب حیات'' ادب کی تاریخ بھی ہے اور بذات خود ادب بھی ہے، ایسا نہیں کہ وہ اس لیے ادیب ہیں کہ انھوں نے اردو شاعری کی تاریخ لکھی ہے، یہ عین ممکن ہے کہ آدمی اردو ادب کی تاریخ لکھے اور بالکل ادیب نہ بن سکے اور اس کی تحریر بے جان ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی آصف جاہی دور حکومت کی مختصر تاریخ اس خوبی سے سپرد قلم کرے کہ اس میں ایک اچھوتا پن ہو، دل کو چھو جانے والی باتیں ہوں، احساسِ جمال ہو، رعنائی خیال ہو، طرز ادا کی شگفتگی ہو، اور لفظوں کا بولتا ہوا چمن ہو، اس میں لطف اور تاثیر ہو، اس طرح کی نگارشات ادب کے زمرے میں داخل ہو جائیں گی۔ گل دستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے اور پھول کے مضمون کو سو رنگ سے باندھنے کا نام ادب ہے، پھولوں کا مجموعہ گل دستہ کہلاتا ہے، اگر اشعار کے مجموعے کو اور خوبصورت عبارتوں کو ان کی رنگینی اور حسنِ ادا کی وجہ سے دستۂ گل اور نمونۂ بہار اور کفِ گل فروش قرار دینا گویا ایک سادہ بات میں ادبی رنگ پیدا کردینا ہے، کیوں کہ اس میں حقیقت کی جگہ مجاز کا استعمال کرلیا گیا ہے، ادبی عبارت وہ ہے جس میں سادہ سی بات میں مجاز، تشبیہ اور استعارہ وغیرہ کا استعمال کرکے اسے زیادہ پرکشش بنادیا گیا ہو، جس طرح ایک بالکل سادہ کپڑے میں کشیدہ کاری کرکے یا کلا وتو، یا سلمی ستارے کا کام کرکے اس سے زیادہ حسین اور جاذب نظر بنا دیا جاتا ہے، اسی طرح ایک سادہ سی بات میں تشبیہ، استعارہ اور کنایہ اور لفظی صنعتوں کا استعمال کرکے اسے زیادہ بلیغ اور مؤثر بنادیا جاتا ہے، اور اسی کا نام ادب ہے۔

یہ ادب روحانی اور مذہبی لٹریچر میں بھی مل سکتا ہے اور شعر وافسانہ کے موضوع پر کتاب میں بھی مل سکتا ہے۔لیکن اس زمانے میں عام غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے کہ غزل کے بارے میں یا

اردو ادب کی تاریخ پر یا غالب اور پریم چند پر لکھنے والا تو ادیب ہے لیکن تفسیر اور حدیث پر یا اصلاح اور تہذیب نفس پر لکھنے والا ادیب نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب کا تعلق لطف تقریر اور حسن تحریر سے ہے، لطافتِ بیان اور خوبی زبان سے ہے نہ کہ مضمون سے۔ ادب کا خاص تعلق حسنِ معنی کے ساتھ لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی تراش وخراش اور گل پیرہنی سے ہے، اس لیے فارسی اور عربی زبان پر عبور رکھنے والے اہل علم اچھی خوبصورت عبارت زیادہ بہتر طور پر لکھ سکتے ہیں بہ شرطیکہ انشا پرداز اہلِ قلم کی تحریریں ان کے مطالعے میں رہیں اور وہ ان سے اکتسابِ فن کرتے رہیں، یہ اس لیے کہ اردو زبان کا خاص مزاج ہے اور جو شخص فارسی وعربی سے بالکل ناواقف ہو، خواہ اس نے دوسری مغربی زبانوں کے ادب کا مطالعہ کرلیا ہو، وہ شخص اردو کے اصل مزاج کی تحریر جسے ادب کہا جاسکے نہیں لکھ سکتا ہے۔ ادب کے حسن سے خالی سپاٹ قسم کی تحریر تو ہر شخص لکھ سکتا ہے، لیکن جو تحریر اپنے ادب کی وجہ سے ذہن ودماغ پر چھا جائے اور دل کے اندر اتر جائے ہر شخص نہیں لکھ سکتا ہے۔ بے نمک کی ابالی ہوئی کھچڑی تو ہر شخص پکا سکتا ہے لیکن اچھے قسم کی حیدآبادی بریانی اور مرغ مسلم ہر شخص نہیں پکا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی صاف کردینا ضروری ہے کہ ادب کے لیے صرف عربی اور فارسی کا جاننا کافی نہیں۔ اگر یہ کافی ہوتا تو مدرسہ کا ہر فارغ اردو کا ادیب بن جاتا۔ اگر اس نے رومی، سعدی، حافظ شیرازی، غالب، اقبال، میر انیس، عبدالحلیم شرر، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد، سرسید اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اور طالب علمی کے زمانے میں ادبی تحریر کی مشق نہیں کی ہے، تو صرف عربی فارسی جاننے سے وہ ادیب اور انشا پرداز نہیں ہوسکتا ہے، لیکن اس نے اگر ادبی کتابوں کا اور اچھے اہلِ قلم کی نگارشات کا مطالعہ کیا ہے اور کچھ نہ کچھ مشقِ تحریر بہم پہونچائی ہے، تو وہ خوبصورت اردو زبان ان سے بہتر لکھ سکتا ہے، جو عربی اور فارسی زبان بالکل نہیں جانتے ہیں۔ نئی نسل میں جو لوگ اردو لکھ رہے ہیں اور جن کی تحریریں اخبارات میں منظر عام پر آتی ہیں، عربی وفارسی سے لاعلمی کی وجہ سے زبان کی غلطیاں ان سے سرزد ہوتی ہیں، اور بعض غلطیاں مضحکہ خیز ہوجاتی ہیں۔ دوسری طرف دینی مدارس کے بیش تر فارغین ہیں جن کا ادبی حاسہ مناسب غذا نہ ملنے کی وجہ سے مردہ ہوچکا ہوتا ہے، جیسے خزاں رسیدہ چمن، جیسے بارش نا آشنا شجر، اور یہ اس وجہ سے کہ زمانۂ طالب علمی میں ان کے ادبی ذوق کے نشو ونما کی فکر نہیں کی جاتی ہے، حالاں کہ مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ کی یہ ذمہ داری ہے کہ طلبا کے ادبی ذوق کی نشو ونما کے لیے خارجی مطالعے کا کورس بھی تیار کریں اور ان کے مطالعے پر اصرار کریں۔

اس کے علاوہ ایک حقیقت اور بھی ہے اور وہ بہت بڑی حقیقت ہے جو شعر وادب کے میدان میں کارفرما عامل ہے، اور وہ ہے ادب کا وہبی اور فطری ذوق۔ اگر یہ ذوق فطرت میں ودیعت نہیں کیا گیا ہے تو بہت زیادہ محنت اور مطالعے سے بھی ایک شخص ادیب اور شاعر نہیں بن سکتا ہے، انسان اکتساب اور عرق ریزی سے بہت بڑا عالم اور اسکالر تو بن سکتا ہے، علم کا چلتا پھرتا انسائکلو پیڈیا بھی بن سکتا ہے، وہ معلومات کا جبل متحرک ہوجاسکتا ہے، لیکن ادیب اور شاعر ہونے کے لیے اس فطری ذوق کا ہونا ضروری ہے، جو وہبی زیادہ اور کسبی کم ہوتا ہے، وہ

خدا جو پنج دہ سالہ مشت آب وگل کو ظاہری حسن کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور دوسرے کو زشت رو بنا دیتا ہے، وہی خدا ایک شخص کو شعر وادب کے ذوق وجمال سے نوازتا ہے، اور دوسرے کو اس ذوق سے محروم کر دیتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس محرومی کی تلافی دوسری نعمتوں سے کر دی جاتی ہے۔ شعر وادب ہر فطری شاعر وادیب کے لیے ایسا ہی ایک ساز فطرت ہے جس طرح بلبل کی نوا، بادنسیم کی سرسراہٹ، اور فراز کوہ سے آتی ہوئی ندی کا نغمہ اور جیسے چاند تاروں کا بن اور جیسے عطر بیز پھولوں کا چمن۔ جس طرح حسن ذاتی تکلف سے بری ہوتا ہے اسی طرح شعر وادب کا وہی حسن دلکش اور دل نواز ہوتا ہے، جس میں آمد ہو آورد نہ ہو، اس ادبی تحریر میں صنعتوں کا مناسب طریقے سے استعمال تو ہوگا کہ ادب نام ہی اس کے فطری انداز میں استعمال کا ہے، لیکن ادبی صنعتوں کا استعمال الگ چیز ہے اور تحریر میں تصنع بالکل الگ چیز ہے۔

ایسے دینی مدارس کے فضلا جہاں اردو شعر وادب کا چرچہ رہتا ہے، جدید دانشگاہوں کے فارغین سے زیادہ بہتر، خوش تر، اور حسین تر زبان لکھتے ہیں، کیوں کہ عربی اور فارسی پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ ندوۃ العلماء کے مؤسسین اور فارغین نے دار المصنفین قائم کیا تھا، اور دار المصنفین کی تمام کتابیں ادب وانشا کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ندوے کے علاوہ دوسرے ادارے بھی ہیں جہاں سے شگفتہ اور سلیس زبان لکھنے والے پیدا ہوئے۔ آخر میں ندوہ کی ممتاز شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے عالمی پیمانے پر رابطہ ادب اسلامی کی تحریک شروع کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی نئی نسل شگفتہ ادبی تحریر لکھنے والی بنے اور مسموم افکار ونظریات کا طاقتور اسلوب کے ساتھ مقابلہ کرے، عالم اسلام کے ادبا اور شعرا نے مولانا ابوالحسن علی ندوی کو اس کا صدر بنایا تھا۔ اس تحریک کی شاخیں دنیا کے بہت سے ملکوں میں ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کے رسالے نکلتے ہیں۔ اردو کی خاموش خدمت کرنے میں مدارس کے علما کا کردار دوسروں سے زیادہ روشن اور تابناک ہے، خاص طور پر ندوۃ العلماء کے فارغین کی تحریروں کا مطالعہ نہ صرف علمی اعتبار سے قاری کو با ثروت بناتا ہے بلکہ ادبی حاسہ کو بھی غذا پہونچاتا ہے۔ ندوۃ العلماء اور دوسرے دینی اداروں کے بہت سے فارغین اور علما ہیں جن کی تحریریں انشاء اور زور تحریر اور دلکشی اور دل آویزی کا نمونہ تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبد السلام ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا مناظر حسن گیلانی، مولانا سید ابوالاعلی مودودی، مولانا امین حسن اصلاحی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی کو اردو کی ادبی تاریخ میں جگہ نہ دینا سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ یہ سب لوگ ادیب وانشاء پرداز تھے اور ان میں کئی صاحب طرز اور صاحب اسلوب ادیب بھی تھے، اور اپنے ادبی اظہار میں ان لوگوں سے بلند تر تھے جن کا نام ادب کے گلیاروں میں اور ادبی مجلسوں میں صبح شام لیا جاتا ہے، ان لوگوں کا ''جرم'' یہ ہے کہ انھوں نے دینی موضوعات کو اپنی علمی اور قلمی سرگرمیوں کا مرکز بنایا، اس لیے ان کے ساتھ تعصب برتا گیا۔ لیکن عالمانہ شناخت کے باوجود ادب کے کئی مؤرخین نے مذکورہ بالا علما کو اپنی تاریخ میں جگہ دی ہے اور ان کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

مناجات

مقبول الٰہی

مالك الملك، لا شريك ہے تو　　أشهد لا إلــه إلا هــو
نورِ ارض و سما میں رخشندہ　　رنگِ صبح و مسا تری خوشبو
تیرے خادم ہیں کلهم أفلاك　　اور مخدومِ ذرہ ذرہ تو
کُن کے لفظِ طلسم سے پیدا　　کــاف کی کائناتِ شش پہلو
کالے، پیلے، سفید، سرخ نژاد　　تیری صناعیوں کی نشو و نمو
دے کے اسود کو جسم نافہ نما　　اس کی آواز میں بھرا جادو
میری تخییل ، یہ ندیمِ قدیم　　تیرا انعام بے نہایت و سو
تیری بخشش، مسرت و غم میں　　صدفِ چشم میں نہاں لُولُو
ہے یہ برحق کہ خاک میری نہاد　　پھر ثنا و صلوٰۃ اور یہ گلو
سب پہ یکساں ہے تیرا فیض یہاں　　نہیں تفریقِ آمنوا، کفروا
شفقِ شام ، شاہدِ شہداء　　رفعتوں کا امیں ہے ان کا لہو
بے طلب نعمتیں ہمیشہ تری　　میری طاعت ، ہمیشہ حیلہ جو
اس کشائش سے آزمائش میں　　رہا مائل ہوں میں بہ نخوت و سو
مجھ پہ بارانِ نعمتِ دنیا　　میری عصیاں تو تیری غفراں، خو
میرے خواب وخیال کیوں دن رات　　بن رہے ہیں عذابِ بے قابو

اس جبلت کی جو بھی تھی ترکیب
اس پہ تھا اور نہیں مجھے قابو

فیتۂ عکسِ یاد پر گزراں
میرے عصیاں کے نقشِ آئینہ رو

عمرِ رفتہ کی چاک دامانی
ہائے کس طور اب کروں گا رفو

تو ہے غفار ، تیری بے حد حمد
میں گنہگار ، مجھ پہ لاکھ تفو

یاس کے سنگِ تہ میں بیٹھی نجات
لاکو سمجھے ، نہ جانے تقنطوا

ساکنانِ وطن کے سینوں میں
شعلہ افزا ہے آتشِ من و تو

پوری ملت پہ آ پڑا ہے یہ وقت
ہے سفال اس کا دوسروں کا سمو

جانتا ہوں ترے غضب کا سبب
ہم میں اسلام کی نہیں خو بو

پھر بھی إیاك نستعین ، اللہ
تیرا فرمان ہے مجھے ادعوا

اپنی ملت کو سرفرازی بخش
تو جو چاہے تو زیر سب ہوں عدو

عزت و عافیت ، قبولیت
ہیں عطائیں تری ، خدائے علو

ہم کھلیں حشر میں گلوں کی طرح
لہلہاتی بہار ہو ہر سو

رحمتوں کی ردا کے سائے میں
ساری مخلوق تیری زمزمہ جو

میری آنکھوں کے نور، دل کے سرور
ہوں مرے سامنے یہ کاخ اور کو

جیسے دنیا میں سازگاری کی
ملیں عقبیٰ میں نعمتوں کے سبو

جلوہ سامانیاں تری ہم پر
ہم ہوں اور تیرے چشم اور ابرو

حرف و معنی کی دے مجھے بھی صفات
مُعطی و مُنعم و مجیب ہے تو

کاش ! حمد و ثنا کے کچھ لائق
آبِ نورِ سحر سے کرلوں وضو

حمد باری تعالیٰ

علیم ناصری

وردِ زباں ہے روز و شب حمدِ خدائے ذو الجلال
جس کا نہیں کوئی مثیل ،جس کی نہیں کوئی مثال

جس کا نہیں کوئی شریک ،جس کا نہیں کوئی سہیم
جس کا وجود جاوداں ، جس کا شہود لا زوال

جس کا کرم مرا بھرم ، جس کی عطا مری نوا
جس کی نظر مری خبر ، جس کی سخا مرا خیال

خالقِ کائنات ہے ، مالکِ شش جہات ہے
مملکت اس کی بے حدود ، سلطنت اس کی بے مثال

احکمِ حاکمیں ہے وہ ، ارحمِ راحمیں ہے وہ
اکملِ کاملیں ہے وہ ، ختم ہے اس پہ ہر کمال

پیش اسی کا اس کا پس ، تحت اسی کا اس کا فوق
شرق اسی کا اس کا غرب ، اس کا جنوب اور شمال

آنکھ سے گو نہاں ہے وہ ، دل میں مگر عیاں ہے وہ
فہم و بصیرت و شعور ، اس کے حضور پر ہے دال

حمد کا حق ادا کرے ذرۂ بے بساط کیا
اس کی صفات لکھ سکے کیا ہے علیم کی مجال

نعتیں

حافظ لدھیانوی

ہر لفظ معجزہ ہے رسالت مآب کا
جو عکسِ دلپذیر ہے ام الکتاب کا

سرکار نے کیا ہے حقیقت سے آشنا
ورنہ نظر فریب تھا پردہ سراب کا

عالم کے واسطے ہے پنہ گاہ جس کا شہر
سایہ ہے دوجہاں پہ اسی کے سحاب کا

میرا ہر ایک لفظ ہے دوری کا غم لیے
ہر شعر آئینہ ہے مرے اضطراب کا

رحمت ہے دوجہاں کے لیے جس کی ذاتِ پاک
دریوزہ گر ہوں میں بھی اسی کی جناب کا

میرے لبوں پہ بات ہے اس کے جمال کی
پھیکا ہے جس کے سامنے رخ آفتاب کا

ہر ایک دل میں روحِ دو عالم کی یاد ہے
ہر اک زباں پہ ذکر ہے رحمت کے باب کا

اللہ کے حبیب کا میں بھی ہوں امتی
مجھ کو ہو فکر کس لیے روزِ حساب کا

حافظ ، ہجومِ شوق میں کچھ سوجھتا نہیں
میں شہرِ نور میں ہوں کہ عالم ہے خواب کا

گداز پھول سا طیبہ کی نوکِ خار میں ہے
وہ شہرِ عشق سدا موسمِ بہار میں ہے

بہائے شب کو تھے آنسو فراقِ طیبہ میں
سحر کو شبنمی ضو، ہجر کے شرار میں ہے

شجر شفاعتِ آقا کا ہے عجب دلکش
کہ حسنِ رحمتِ حق اس کے برگ و بار میں ہے

خدا نے مجھ کو عطا کی ہے حبِ ختمِ رسل
کرم یہ خاص ، کرم ہائے بے شمار میں ہے

چلا ہے لے کے وہ پہلو میں منزلِ عرفاں
وہ قافلہ ، کہ مدینے کی رہ گزار میں ہے

ہوں مستنیر نبوت کے آفتاب سے میں
ڈلک ضیاؤں کی اب روح کے غبار میں ہے

ہے کس کی نور سواری رواں شبِ اسریٰ
ستارہ بار چمک گردِ راہوار میں ہے

مدینے آ کے ملا اپنی زندگی کا سراغ
جھلک دوام کی لمحاتِ مستعار میں ہے

الٰہی ! وہ مرے کردار میں بھی آجائے
وفا کا رنگ جو نعتوں کے لالہ زار میں ہے

قرآن کا ادبی اعجاز

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

قرآن کلام الٰہی ہے۔ یہ ادب کی معراج ہے۔ بلاغت کا سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ متقدمین سے لے کر متاخرین تک بے شمار ماہرینِ زبان وادب نے اسرارِ بلاغتِ قرآن کو اپنا موضوع بنایا۔ اسرارِ بلاغت سے آگاہ ہونا اور ان کا ذوق آشنا ہونا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ قرآنِ کریم کی تلاوت کر لینا ثواب کی بات ہے، اس کے مفاہیم کو جاننے کی کوشش کرنا واجب بھی ہے اور زیادتی اجر کو مستوجب بھی ہے۔ لیکن غزالانِ بلاغت کے مرغزار تک پہنچنے کے لیے عربی زبان وادب پر ملکہ تامہ کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے معانی و بدیع کے فن پر کامل دستگاہ کی حاجت ہے، اور اس کے لیے اعلیٰ درجے کا ذوق درکار ہے۔ اس کے لیے قدیم و جدید ماہرینِ زبان وادب کے منظوم و منثور، مسجوع و مرسل کلام کے گہرے مطالعے کی ضرورت ہے۔ پھر اس کے ساتھ توفیقِ الٰہی کی ارزانی بھی چاہیے۔ اسی میدانِ ادب میں قرآن نے عربوں کے ماہرینِ زبان کو چیلنج دیا تھا اور کہا تھا کہ اس جیسی ایک سورۃ بھی لا کر دکھاؤ۔ عرب جو اپنی زبان آوری اور زبان دانی پر ناز کرنے والے تھے، چند آیتیں بھی اس جیسی پیش کرنے سے عاجز رہے، اور اس کلامِ بلاغت نظام کے سامنے حیران اور ششدر رہ گئے۔ انگشت بدنداں تھے۔ سر بگریباں تھے۔ اور جو ضد، نفس پرستی اور عناد کا شکار نہ تھے، وہ اس پر ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرتے تھے۔ مشرکینِ مکہ کو قرآن کے ادبی اعجاز کا اور اس کی غیر معمولی تاثیر کا پورا اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے ان کی کوشش ہوتی تھی کہ لوگ یہ کلام نہ سنیں۔ عرب کے قبائل جو حج کے لیے آتے ان کو اس کلام کو سننے سے روکنے کی پوری کوشش کی جاتی۔ ان کو نبی کریم (ﷺ) سے ملنے نہیں دیا جاتا۔ انھیں بتایا جاتا کہ یہ کلام وہ جادو ہے جو خاندانوں میں جدائی ڈال دیتا ہے۔ ان ساری کوششوں کے بعد بھی کوئی اگر اس کلام کو سن لیتا تو ایمان لے آتا۔ وہ ایمان لانے پر خود کو مجبور پاتا۔ اس کی بہت سی مثالیں تاریخ نے اپنے رکارڈ میں محفوظ کر لی ہیں۔

سیرت ابن ہشام کی روایت ہے کہ جبیر بن مطعم بن عدی ایک غرض سے حضور اکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آپ سورہ طور کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب آپ سے انھوں نے یہ آیت سنی ﴿ إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ، مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ﴾ تو ان پر کپکپی طاری ہو گئی اور انھوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔ عقبۂ اولیٰ کے موقع پر جب آپ نے مدینے سے آنے والوں کے سامنے قرآن کی تلاوت کی تو سب ایمان لے آئے، اور جب وہ یثرب واپس ہوئے تو قرآن سن کر لوگ اس کے اعجاز کے قائل ہو گئے۔ اور ہر گھر میں اسلام پھیل گیا اور پورا مدینہ قرآن کے ذریعے ہی فتح ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام کی خبر سن کر ان کے قتل کے ارادے سے آئے تھے لیکن سورہ طٰہٰ کی آیات سن کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ان کی زندگی میں

انقلاب آ گیا اور حضورِ اکرم (ﷺ) کی خدمت میں حاضر ہو کر کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو گیے۔ مدینے میں اسید بن حضیر غصے کی حالت میں مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی سرزنش کے ارادے سے آئے اور قرآن کی آیتیں سنتے ہی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہو گیے۔ جو چیز آن کی آن میں دلوں کا پایا پلٹ دیتی تھی، وہ قرآن کی ادبی اعتبار سے نہایت دلکش آیتیں ہوتی تھیں۔ عربی زبان و بیان میں ان کی مہارت اور بصیرت کہتی تھی کہ یہ انسانی کلام نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا سرچشمہ کچھ اور ہے۔ قریش کے سرداروں میں متعدد ایسے تھے جو لوگوں سے چھپ چھپ کر قرآن سنتے تھے اور متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ قریش کے لوگوں نے ایک بار عتبہ بن ربیعہ کو سمجھوتے کے لیے قاصد بنا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا۔ حضور (ﷺ) نے اس کی بات سننے کے بعد سورہ ''فصلت'' کی تلاوت کی، اس کے بعد عتبہ اپنی قوم کے پاس آیا۔ لوگوں نے دیکھتے ہی کہا کہ ابوالولید (عتبہ) کا چہرہ بدلا ہوا ہے۔ یہ قرآن تھا جو فوراً دل کے اندر اتر جاتا تھا اور پتھر دلوں کو موم کر دیتا تھا۔ اس میں نہ ساحری تھی، نہ شاعری تھی۔ لیکن ان دونوں سے بڑھ کر اس میں اثر انگیزی اور دلکشی تھی۔

قرآن کے جمالِ ادب کے جلووں سے ذوق آشنا کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اور عربی زبان کی خوبیوں اور باریکیوں پر اگر گہری نظر نہ ہو تو ان کو سمجھ لینا بھی بہت دشوار ہے۔ ادب کا تعلق ذوق سے ہے۔ یہ ایک ملکہ ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا جاتا ہے۔ صرف سورۂ فاتحہ کی مثال لے لیجیے جسے ہر نماز میں پڑھنا ضروری ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں سورۂ فاتحہ کی دلکش اور دل آویز تفسیر لکھی ہے۔ لیکن اس سورہ کا جو ادبی حسن و جمال ہے، اس کا کوئی تذکرہ ان کی تفسیر میں نہیں ہے کیونکہ اردو کے قارئین کو نہ تو اس کا سمجھانا آسان ہے اور نہ ان کے لیے ادب کی خوبیوں کا ادراک کر لینا سہل ہے۔ اس لیے ان کی تفسیر میں اس سورت کے فواصل کے حسن کا تذکرہ نہیں۔ غور کیجیے کہ ﴿ الحمد للہ ﴾ حسنِ مطلع، حسنِ آغاز اور براعتِ استہلال کا آئینہ دار ہے۔ الحمد کا الف لام استغراق اور شمولیت کا فائدہ دیتا ہے، صرف تعریف نہیں بلکہ ہر قسم کی تعریف اس کے مفہوم میں شامل ہے۔ ﴿ إیاک نعبد و إیاک نستعین ﴾ میں تقدیم و تاخیر نے حصر کے معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ یعنی ہم صرف اور صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف اور صرف تجھ سے مدد کے طالب ہیں۔ ﴿ الصراط المستقیم ﴾ کے ابہام کے بعد ﴿ صراط الذین أنعمت علیهم ﴾ کی تصریح بلاغت کی جان ہے۔ نعبد اور نستعین میں جمع کی ضمیر اس بات کا اشارہ دے رہی ہے کہ بندہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں تنہا تیرے عظیم دربار میں کھڑے ہونے اور اپنی مناجات پیش کرنے کی ہمت نہیں کرتا ہوں، اس لیے لاکھوں کروڑوں بندگانِ خدا کے ساتھ ملتمس رحمت و عنایت ہوں۔ ہم سب تیرے بندے ہیں، تیری بندگی کرتے ہیں اور تجھ سے مدد کے خواستگار ہیں۔ آیتوں میں 'ن' اور 'م' قریب المخرج حروف ہیں اور حروف تہجی کی ترتیب میں بھی متصل آئے ہیں۔ عالمین اور دین اور نستعین کے ساتھ ساتھ ﴿ الرحمن الرحیم ﴾ اور ﴿ الصراط المستقیم ﴾ کی صوتی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ سورہ میں الفاظ اور آیتوں میں روانی ہے۔ تلاوت کرنے میں یا یاد کرنے میں اس سے آسانی پیدا ہوتی ہے۔ ﴿ غیر المغضوب علیهم و لا الضالین ﴾ میں جو صوتی فخامت، ہیمنت اور جلالت پائی جاتی ہے، وہ مہیمن اور منتقم اور مقتدرِ اعلیٰ کی جلالتِ شان کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سورہ کا

مجموعی رنگ جمال کا ہے لیکن جلال کے رنگ سے بالکل خالی بھی نہیں۔ یہ صرف ایک سورہ کے گلشنِ بلاغت کے چند پھول ہیں۔

انگریزی زبان وادب کے ایک مشہور ناقد کا قول ہے کہ ادبی عبارت میں ہر لفظ اپنے صحیح محل پر ہوتا ہے۔ وہ عبارت ایک زندہ جسم کے مانند ہوتی ہے۔ ایک لفظ بھی اِدھر سے اُدھر کر دیا جائے تو اس سے خون بہنے لگے گا۔ قرآنِ مجید کا معیار اس نقدِ کامل عیار سے بھی زیادہ بلند ہے۔ اس کا کوئی لفظ دوسرے لفظ سے بدلا نہیں جاسکتا ہے۔ ہر لفظ ایک نگینے کی طرح عبارت کی انگوٹھی میں جڑا ہوا ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی متلو آیات ہیں لیکن یہ کائنات غیر متلو آیت ہے۔ اس میں اللہ کی مرئی آیات (نشانیاں) پھیلی ہوئی ہیں، یعنی ان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کائناتِ رنگ و بو میں خالقِ ارض و سماوات کی آیتیں یعنی نشانیاں ہر طرف موجود ہیں جو اس کے وجود کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ خاورِ صبح جب نمودار ہوتا ہے، ہر طرف روشنی پھیل جاتی ہے۔ اور جب ڈوبتا ہے تو طشتِ افق پر لالے کے پھول بکھیر دیتا ہے۔ ماہتاب چاندی کے ورق برساتا ہے اور رات کو روشن اور نورانی بنا دیتا ہے۔ لیلائے شب کی سیاہ زلفوں میں ستارے جھلملاتے ہیں۔ آسمان کی مانگ میں دمکتی ہوئی کہکشاں نظر افروز حسن کا منظر پیش کرتی ہے۔ جس طرح چاند اور ستارے زیوراتِ آسمانی ہیں اور گل ہائے رنگ رنگ زیوراتِ ارضی ہیں، اسی طرح سے قرآن کی تمام آیتیں زیوراتِ لفظی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح سے بینائی سے محروم شخص کے لیے حسن و جمال کے یہ جلوے کوئی معنی نہیں رکھتے، اسی طرح سے عربی زبان کی بلاغت سے ناآشنا شخص کے لیے قرآن کے ادبی حسن کا پورے طور پر ادراک کرنا محال ہے۔ اس میں معانی اور مطالب کا جو دریائے بے کراں ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ جس طرح سے بصارت سے محروم شخص کے مقابلے میں دیدۂ بینا رکھنے والا انسان بینائی کی عظیم نعمت سے سرفراز ہے، اسی طرح عربی زبان وادب سے ناآشنا شخص کے مقابلے میں عربی زبان اور قرآنِ مجید کا ذوق رکھنے والا انسان خوش نصیب ہے اور عظیم نعمت سے بہرہ ور ہے۔ مختلف زبانیں اپنی اپنی جگہ پر اہم ہیں لیکن ان میں سیادت کا مقام عربی زبان کو حاصل ہے۔ چونکہ عربی زبان وادب میں رسوخِ کامل کے بغیر قرآن کے ادبی حسن و جمال کو نہیں سمجھا جاسکتا ہے، اس لیے مترجمین اور مفسرین اس جمال کا تذکرہ کیے بغیر آگے بڑھ جاتے ہیں، حالانکہ اکثر اربابِ بلاغت وادب کے نزدیک ادبی کمال ہی وہ میدان ہے جس میں قرآن نے عمائدینِ ادب کو چیلنج دیا تھا کہ اگر یہ انسانی کلام ہے تو اس جیسا کلام پیش کر کے دکھاؤ۔ اکثر علماءِ سلف کی رائے یہی ہے۔ بعض علمانے اعجاز کے دوسرے پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔

مولانا مودودی لکھتے ہیں: ''بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیلنج محض قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی ادبی خوبیوں کے لحاظ سے تھا، اعجازِ قرآن پر جس انداز سے بحثیں کی گئی ہیں، ان سے یہ غلط فہمی پیدا ہونا کچھ بعید نہیں لیکن قرآن کا مقام اس سے بلند تر ہے کہ وہ اپنی یکتائی اور بے نظیری کے دعوی کی بنیاد محض اپنے لفظی محاسن پر رکھے۔ بلاشبہ قرآن اپنی زبان کے لحاظ سے بھی لاجواب ہے''۔

علامہ شبلی رقم طراز ہیں: ''غور کرو، قرآنِ مجید کی فضیلت کے بیان میں اس کو ناصح، رہنما، بشیر اور نذیر، نور، حکیم سب کہا، لیکن فصاحت اور بلاغت کا کہیں نام تک نہیں آیا، اور وہی چیز چھوڑ دی گئی ہے جو لوگوں کے نزدیک مدارِ اعجاز ہے۔ کیا ہدایت اور حکمت کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کا جواب ہوسکتی ہے؟ اگر

نہیں ہوسکتی ہے تو یہ اوصاف کیوں معجزہ نہ ہوں!! اس کے یہ معنی نہیں کہ فصاحت اور بلاغت میں قرآن کا جواب ہوسکتا ہے۔ بے شبہ نہیں ہوسکتا اور قیامت تک نہیں ہوسکتا''۔

سرسید، علامہ شبلی اور مولانا مودودی کا یہ نقطۂ نظر ہے، لیکن علامہ شبلی کے شاگردِ رشید مولانا سید سلیمان ندوی کے نزدیک قرآن کی فصاحت و بلاغت اصل سببِ اعجاز ہے۔ سیرۃ النبی جلد سوم میں ان کا واضح موقف موجود ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی موقف ہے جو انھوں نے سورۃ النحل کی آیت نمبر ۱۰۳ ﴿ لسانُ الذين يلحدون إليه أعجمي و هذا لسان عربي مبين ﴾ کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی نے لکھا ہے کہ میرے نزدیک اور اکثر علما کے نزدیک قرآن کا اعجاز اس کی فصاحت اور بلاغت ہے۔ انھوں نے اپنی عربی کتاب " القائد إلى عيون العقائد " میں اپنے اس موقف کی تصریح کی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اسلوب بدیع اور ادب و بلاغت کے اعتبار سے قرآن کا معجز ہونا تسلیم کیا ہے۔ الفوز الکبیر میں ان کا یہ موقف موجود ہے۔

قدیم مفسرین ادبی اعجاز کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ لیکن جو اہل علم اعجاز کے دوسرے پہلو بیان کرتے ہیں، وہ بھی ادبی اعجاز کے پہلو کا انکار نہیں کرتے ہیں۔ لبید جیسے شاعر نے قرآن کے نزول کے بعد شاعری چھوڑ دی تھی۔ جب قرآن نے چیلنج دیا تھا، اس وقت قادر الکلام شعرا اور زبان وادب کے جوہری موجود تھے، ان میں کوئی بھی اس چیلنج کا جواب دینے کی ہمت نہیں کرسکا تھا اور نہ بعد کی صدیوں میں کوئی جواب دے سکا۔ وہ جان گئے کہ قرآن خارقِ عادت کلام ہے۔ یہ ایک معجزہ ہے جو پیغمبر اسلام (ﷺ) پر نازل کیا گیا ہے۔ یہ قرآن نبوت کے لیے برہان ہے۔ یہ پیغمبر کا کلام نہیں۔ پیغمبر کے کلام کے نمونے احادیث میں موجود ہیں۔ اس میں بھی بلاغت اور فصاحت موجود ہے۔ لیکن اس کے اسلوب اور قرآن کے اسلوب میں آسمان اور زمین کا فرق ہے۔ اور زبان اور اس کے اسالیب کا جاننے والا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ دونوں کا منبع ہرگز ایک نہیں ہوسکتا ہے۔ قرآن کی ایک چھوٹی سی آیت ہے ﴿ و لكم في القصاص حياة ﴾ اس آیت کا ایجاز اس کا اعجاز ہے۔ دریا کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے۔ کہا گیا کہ تمھارے لیے قصاص کے اندر حیات پنہاں ہے۔ اس سے قریب ترین ایک جملہ عربوں میں رائج اور متداول تھا" القتل أنفىٰ للقتل " یعنی قتل کردینا جرمِ قتل کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن دونوں میں آسمان زمین کا فرق ہے۔ لفظ قصاص میں عدل کا مفہوم شامل ہے جو لفظ قتل میں موجود نہیں ہے۔ اور لفظ حیاۃ کے اندر قصاص کے جو بے پناہ فائدے ہیں، ان کا اظہار ہے۔ لفظ حیاۃ کے نکرہ (Indefinite Noun) استعمال ہونے کی وجہ سے معنی میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ جسمانی زندگی، روحانی زندگی، تہذیبی زندگی، تمدنی زندگی، الغرض ہر طرح کی زندگی اس کے مفہوم میں داخل ہوگئی۔ عربوں کے متداول محاورے میں لفظ قتل کی تکرار ہے۔ قرآن کی عبارت تکرار کے عیب سے خالی ہے۔ اس کے حروف میں انسجام اور ہم آہنگی ہے۔ زبان سے اس کا ادا کرنا عربی کے متداول جملے کے زبان سے ادا کرنے کے مقابلے میں آسان ہے۔ اسی طرح سے قرآن کی آیت ﴿ فدمدم عليهم ربهم بذنبهم فسواها ﴾ میں " دمدم " کا لفظ غور کرنے کے لائق ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ رب کا عذاب نازل ہو رہا ہے اور اس کی دھمک

سنائی دے رہی ہے۔

قوم نوح پر عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے اور سیلاب وطوفان نے ان کو اوران کی عمارتوں کو تہِ آب غرق کردیا۔اس طوفان کے تھمنے کا تذکرہ قرآن نے جن الفاظ میں کیا ہے وہ ادب کا اعجاز ہے۔﴿ و قيل يا أرض ابلعي ماء ک ، و يا سماء أقلعي ، و غيض الماء ، و قُضِيَ الأمرُ، و استوت على الجودي، و قيل بُعدًا للقوم الظالمين ﴾ (ہود:۴۴) یعنی حکم ہوا اے زمین! اپنا سارا پانی نگل جا، اور اے آسمان! بس کر۔ چنانچہ پانی زمین میں پیوست ہوگیا۔ فیصلہ کردیا گیا۔کشتی جودی پہاڑ پر رک گئی اور کہہ دیا گیا دور ہو ظالموں کی قوم۔اس آیت کی بلاغت کو کن الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔وسیع عربی زبان کا کوئی دوسرا لفظ ابلعي سے زیادہ یہاں موزوں نہیں ہوسکتا۔" ابلعي " کی مناسبت سے اسی وزن اور شان کا لفظ " أقلعي " ہے۔شروع میں " ماء ك " کی صراحت موجود ہے۔" أقلعي " کے بعد اس صراحت کی ضرورت نہیں، اس لیے اسے حذف کردیا گیا۔اس کے بعد " غيض "اور" قضي " کے مجہول صیغے (Passive Voice) میں استعمال نے عجیب حسن پیدا کردیا ہے۔ پوری عبارت سبک سبک ٹکڑوں سے مرکب ہے۔آخری ٹکڑا نسبتاً طویل ہے کہ بلاغت کا اور زبان کے حسنِ تناسب کا یہی تقاضا تھا۔

فرعون کے بارے میں وارد ہوا ہے:﴿ إن فرعون علا في الأرض ﴾ فرعون کی نخوت اور سرکشی، غلبے اور تحکم کے تیور کے بیان کے لیے " علا " سے بہتر لفظ نہیں مل سکتا ہے۔اس لفظ میں ایک قسم کی صوتی محاکات پائی جاتی ہے۔حروفِ حلقی میں عین کا استعمال اور پھر لام اور الف کی سربلندی اقتدار اور غلبے کا مفہوم متعین کرتی ہے۔قرآن میں ہے:﴿ لكل جعلنا منكم شرعة و منهاجاً ﴾ ،شریعت اور منہاج مفہوم کے اعتبار سے قریب الفاظ ہیں، پھر بھی شرعہ شروع کے حصے پر دلالت کرتا ہے اور اس لیے اس کا استعمال پہلے کیا گیا اور منہاج کو اس پر عطف کیا گیا۔رؤیا اور حلم دونوں کے معنی خواب کے ہیں۔قرآن میں سچے خواب کے لیے ہر جگہ رؤیا کا لفظ ہے یعنی اس کا سچ ہونا ایسا ہی یقینی ہے جیسے عینی رؤیت۔قرآن میں سچے خواب کے لیے ہر جگہ یہی لفظ استعمال ہوا ہے، جیسے ﴿ يا إبراهيم قد صدقت الرؤيا ﴾۔اس کے مقابلے میں خواب ہائے پریشاں کے لیے " أضغاث أحلام " کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ آنس اور أبصر دونوں کے معنی دیکھنے کے ہیں لیکن قرآن میں آنس کا لفظ صرف اسی چیز کے لیے استعمال ہوا ہے جس کے دیکھنے سے انسیت اور خوشی حاصل ہو جیسے ﴿ إني آنست نارًا ﴾ اور ﴿ فإن آنستم منهم رشدًا ﴾ وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ قرآن مجید میں کہیں کوئی لفظ بے محل استعمال نہیں ہوا ہے۔ ہر جگہ ایک خاص حسن اور نظم پایا جاتا ہے۔ ہر جگہ ایک نغمگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ہر موقع کے لیے مناسب ترین لفظ کا انتخاب کیا گیا ہے۔قرآن کی بہت سی سورتوں میں سجع کا انداز ہے اور تلاوت کے وقت محسوس ہوتا ہے کہ فردوس گوش نغمہ ہے جو کانوں کے ذریعے دل میں اتر رہا ہے۔یہ سحر سے زیادہ سحر انگیز اور شعر سے زیادہ مسرت بخش اور چاند ستاروں سے زیادہ دلوں کے ظلمت کدہ کے لیے ضیا افروز ہے۔لیکن ان باتوں کا ادراک کرنے کے لیے عربی زبان وادب کا ذوق اور قرآن میں تدبر کا شوق درکار ہے۔اس مختصر مضمون میں قرآن کے بے بہا اعجازِ بیان وبلاغت کی صرف چند جھلکیاں ہی دکھائی جاسکتی ہیں۔☆☆☆

قرآن مجید میں ہدایتی اسلوب
اور حسن تعبیر و بلاغت کا امتزاج

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی
ناظم ندوۃ العلماء، وصدر عالمی رابطہ ادب اسلامی، برصغیر

قرآن مجید رب العالمین، خالقِ کائنات ومخلوقات کا کلام ہے۔ وہ ان کا صرف خالق ہی نہیں، بلکہ وہ ان کی صلاحیتوں کا بھی پیدا کرنے والا ہے۔ اس کے اس کلام میں بات سے صرف واقف کرانا نہیں، بلکہ مخاطبین کے قلب ودماغ کو ان کے وجود کے مقصد اور ان کے صلاح وفلاح کی بات سمجھانا بھی ہے۔ مخاطبین کے سمجھنے کی صلاحیت اور ان کے قلب ودماغ کی کیفیت اسی خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی ہے، اس کے علاوہ اور کون ان کی مقدار فہم وادرک اور قبول کرنے کی صلاحیت کو جان سکتا ہے؟ وہ یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ کسی ایک انسان کی صلاحیتوں کی مقدار دوسرے انسان کی صلاحیتوں سے کیا فرق رکھتی ہے، اور اس فرق کا کیا لحاظ ہونا چاہیے اور ان کے فائدے کا جو تقاضا ہوسکتا ہے، یہ سب خالقِ کائنات کے علاوہ کون جان سکتا ہے، لہٰذا قرآن مجید میں جو کلام اختیار کیا گیا وہ ان رعایتوں کے لحاظ سے جو بہتر سے بہتر صورت ہوسکتی ہے، قرآن مجید اس پر مشتمل ہے، معمولی صلاحیت کے انسان کے لیے کیا مضمون ہوسکتا ہے، اور ذہین وحساس انسان کے لیے کس طرح کا مضمون مناسب ہے، یہ وہ خوبی ہے جس نے قرآن مجید کو معجزہ بنادیا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔ قرآن مجید کی اس خوبی اور مقصد برآری میں اس کی کامیابی کے نئے نئے پہلو گذشتہ چودہ سو سال کی تاریخ میں برابر اہل علم و اہل تحقیق کے سامنے آتے رہے ہیں، اور آج جب کہ چودہ سو سال گذر گئے ہیں، نئے نئے پہلوؤں کا انکشاف جاری ہے۔

قرآن مجید کے براہ راست مخاطب عرب اور عربی سے واقف حضرات تھے، اور وہ مؤثر کلام سے اثر لینے اور کلام عربی کے سمجھنے کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے اور کلام کی باریکیاں بڑی حد تک سمجھنے والے تھے، اس کی بنا پر انھوں نے کلام الٰہی سے حسبِ ضرورت خوب فائدہ اٹھایا، اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے، اور ان پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ وہ دوسروں تک اس کو پہنچائیں، چنانچہ یہ کام بھی بہت اچھی طرح انجام پایا، اور جو حضرات کلام عربی کا اچھا ذوق وصلاحیت رکھتے ہیں، وہ قرآن مجید کے کلام سے اس قدر متأثر ہوتے ہیں کہ اس کی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی ۔ وہ قرآن مجید کے لفظ لفظ میں پوشیدہ

خوبیوں کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ یہ انسانی کلام نہیں ہوسکتا، یہ یقیناً الٰہی کلام ہے، اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اس کا حق ادا کرتے ہیں لیکن جو لوگ علمی شغف رکھتے ہیں اور کلام کی باریکیوں اور خوبیوں کے ادراک میں عام انسانوں سے بڑھے ہوئے ہیں، وہ دوسروں کے مقابلے میں اس بات کی زیادہ واقفیت رکھتے ہیں کہ قرآنی کلام خوبیوں کے لحاظ سے انتہائی مؤثر اور متنوع خوبیوں کا ہے، بلکہ اس کا لفظ لفظ اور اس کا ہر پہلو معجزے کی حیثیت رکھتا ہے، اور انسان ضروری حد تک اس کو سمجھنے اور حسبِ ضرورت فائدہ اٹھانے کے دائرے میں ہے، اور یہ کہ کوئی انسان اس کے مطابق کلام نہیں پیش کرسکتا۔ اگر سارے لوگ جمع ہوجائیں اور قرآن مجید جیسا کلام اور اس جیسی آیات پیش کرنے کی کوشش کریں تو وہ عاجز ہی رہیں گے۔ گذشتہ تاریخ میں بعض لوگوں نے اس کی ناکام کوششیں کیں، اور سب نے محسوس کرلیا یہ ان کا گڑھا ہوا ہے، اس بات کو اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما بھی دیا ہے۔

﴿ قُل لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَن يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا ﴾ [اسراء:۸۸]

''آپ کہہ دیجئے کہ اگر [کل] انسان وجنات اسی بات کے لیے جمع ہوجائیں کہ اس قرآن کا سا [قرآن] لے آئیں [جب بھی] اس کا سا نہ لاسکیں گے خواہ ایک دوسرے کے مددگار ہی بن جائیں۔''

اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کی صلاح و بہبود اور فلاح اخروی کی رہنمائی کے لیے نازل کی گئی آخری کتاب قرآن مجید رضائے الٰہی کے حصول کی راہ کے لیے ایسی مشعلِ ہدایت کتاب ہے کہ اس کی روشنی سے انسانوں کو کوئی استغنا نہیں اور جو بھی اس سے استغنا برتتا ہے وہ حقیقی اور دائمی کامیابی سے محروم ہوجاتا ہے۔ مزید یہ کہ وہ کلام الٰہی ہونے کی بنا پر مقدس کلام اور آسمانی مقام اور بلند و بالا مرتبہ رکھتا ہے، اسی لیے اس کی صرف تلاوت بھی عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور رضائے الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور اس کے مضامین اور مطالب دنیاوی زندگی میں صلاح اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہ اپنی اعلیٰ صفات اور خصوصیات کی بنا پر حقائق و اسرار کا گنجینہ ہے جس کے متنوع پہلو اور اسرار برابر کھلتے رہتے ہیں اور اس کے نئے نئے فوائد سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس کی طرف اشارہ کے طور پر خود قرآن مجید میں کہیں اس کو ''نور'' یعنی روشنی، کہیں اس کو ''المبین'' یعنی بات کو واضح کرنے والا، کہیں اس کو ''حکیم'' یعنی حکمت ودانائی والا کلام، کہیں اس کو ''عربی'' یعنی فصاحت وبلاغت کا کلام، کہیں پر اس کو ''ذکریٰ'' یعنی یاد دلانے والا کلام، کہیں اس کو ''ہدیٰ'' یعنی رہنمائی کرنے والا، کہیں اس کو ''فرقان'' یعنی اچھے اور برے کا فرق بتانے والا، کہیں اس کو ''رحمت'' یعنی اپنے ماننے والوں کے لیے خیر اور رحمت کا باعث بننے والا کلام، کہیں اس کو ''شفاء'' یعنی باطنی خرابیوں سے نکالنے والا کلام، کہیں اس کو ''ضیاء'' یعنی روشنی والا کلام، کہیں اس کو ''مبارک'' یعنی برکت عطا کرنے والا کلام، کہیں اس

کو ''عزیز'' یعنی مضبوط اور غالب کلام، کہیں اس کو ''کریم'' یعنی عزت دلانے والا کلام، کہیں اس کو ''علی'' یعنی بلند مقام والا کلام، اور کہیں اس کو ''امّ الکتاب'' کا جز یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے پوری کائنات اور مخلوقات کے لیے طے کردہ ارادوں اور رایوں کے دفتر کا خصوصی حصہ قرار دیا گیا ہے، اس طریقے سے قرآن مجید ایسی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے کہ جس کی متنوع صفات اور خصوصیات اور انسانی فلاح وصلاح کی ضرورت کے لیے اس سے زیادہ کارگر کوئی کتاب نہیں ہے۔

انسانوں کو انسان کے مزاجی تنوع اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے سمجھاتا اور رہنمائی کرتا ہے ،اور اس سمجھانے اور اصلاح کی طرف متوجہ کرنے کے ایسے نمونے جن میں انسان کے مزاجی اور نفسیاتی تنوع کی رعایت ہے، اس کے کلام مجید میں بہت مؤثر اسلوب میں پائے جاتے ہیں ،اور وہ اس کی مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں، مثلاً سورۂ تکاثر میں بیان ہے کہ حق سے منحرف انسان میں خودغرضی اور خواہش نفس کے لیے فکرمندی اور شوق اتنا بڑھ جایا کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح منہمک ہوجاتا ہے کہ بالآخر اس کی موت کا وقت آجاتا ہے، اور اس وقت اس کو اپنے برے انجام کا پتہ چلتا ہے کہ ہائے کیا ہوا، اور پھر اپنی غفلت کا انجام جہنم کی شکل میں دیکھتا ہے ،اور یہ کہ اب اپنے رب کے سامنے جواب دہی اور حساب دینا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتَّى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ○ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ○ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ، كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ○ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ○ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ○ ﴾

[سورہ تکاثر]

''تم کو [مال ودولت کی کثرت کی فکر] نے غافل کردیا ہے یہاں تک کہ تم قبروں تک پہونچ گیے ۔دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہوجائیگا ۔دیکھو اگر تم جانتے [یعنی] علم الیقین [رکھتے تو غفلت نہ کرتے] تم دوزخ دیکھوگے، پھر اس کو ایسا دیکھوگے کہ عین الیقین [آجائیگا] پھر اس روز تم سے [دنیا میں ملی ہوئی] نعمت کے بارے میں پرسش ہوگی)۔

اسی طرح سورۂ ماعون میں بھی اللہ نے ایسے انسان کی تصویر ظاہر کی ہے، جو خودغرضی اور من مانی زندگی میں ڈوبا ہوا ہے، اور اپنے رب کی اطاعت اور حق بات کو قبول کرنے سے بالکل باغی ہوجاتا ہے ۔ وہ اوّلاً اپنے رب کے احکام کا انکار کرتا ہے ، اور اس کا رویہ یہ ہوجاتا ہے کہ اپنے علاوہ دوسروں کے ساتھ ہمدردی سے گریز کرتا ہے، یتیم کو دھتکارتا اور غریب کو کھانے کی مدد دینے کے لیے نہیں کہتا، اور [اپنے رب کی عبادت] نماز سے غفلت برتتا ہے ، اور دکھاوے کے کام میں لگا رہتا ہے، اور چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی کو دینے میں بخل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿ أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ، فَذَلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ، وَلَا يَحُضُّ عَلَى طَعَامِ

الْمِسْكِينِ، فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ، الَّذِينَ هُمْ يُرَاؤُونَ، وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ﴾ [ماعون]

''بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے، یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لیے لوگوں کو ترغیب نہیں دیتا، تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے، جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں، اور برتنے کی چیزیں عاریۃ نہیں دیتے''۔

اسی طرح سورۂ والعصر دیکھیے اس مختصر سورہ میں اللہ تعالیٰ کامیاب انسان کی کیفیت پیش فرماتا ہے، زندگی کے عظیم نقصان سے وہی انسان بچتا ہے جس نے اپنے رب کے احکامات کو تسلیم کیا ہو، اور ان کے مطابق اچھے اعمال اختیار کیے ہوں، اور ایک دوسرے کو اچھی باتوں کی طرف متوجہ کرتا رہا ہو، اور تبلیغ حق میں اس کو جو پریشانیاں لاحق ہوتی ہوں یا مخالفتیں ہوتی ہوں تو ان کو بسر وچشم برداشت کیا ہو، اور برداشت کرنے کا آپس میں مشورہ دیا ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَالْعَصْرِ ○ إِنَّ الْإِنسَانَ لَفِي خُسْرٍ ○ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ○ ﴾

''زمانے کی قسم انسان نقصان میں ہے مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین کرتے رہے اور صبر کی تاکید کرتے رہے''۔

اسی طرح دیکھا جائے تو قرآن مجید میں بکثرت مثالیں انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے سلسلے میں انسانوں کے مزاج اور ان کی طبیعتوں کے حوالے سے بڑی متنوع اور پراثر طور پر بیان کی گئی ہیں۔ ان کے ذریعے قرآن مجید ہر طرح کے انسانوں کی نفسیات کی رعایت کے ساتھ ان کی ہدایت کا سامان کرتا ہے، اور اس طریقے سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بہت کامل اور مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے، اور انسانی فطرت کا ایسا لحاظ کرتا ہے کہ سننے والے کے دل میں بات اتر جائے، اور کسی بھی قسم کا انسان ہو اس کو اس کے خیر کی بات اس میں مل جائے اور اس کو لغزش سے بچانے والی بات اس کے سامنے آجائے۔ اس طرح یہ انسانوں کی ہدایت وفلاح و بہبود کے لیے ایسی کامل رہنما کتاب ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

عربوں کی زندگی تمدن سے دور ہونے اور معاشی حالت کی کمزوری کی وجہ سے جسمانی محنت اور جفاکشی پر مجبور کرتی تھی، اور خودداری اور قومی غیرت وحمیت بہت جلد جنگ پر آمادہ کرتی تھی۔ خشک علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی کچھ قدریں بن گئی تھیں، جس سے آپس میں لڑائیوں کی نوبت آتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسافروں کی مدد اور خاطرداری خشک علاقوں میں ان کی ضرورت بن گئی تھی، جس کے سبب مسافر ومہمان کے ساتھ بہت زیادہ ہمدردی کا جذبہ

عام تھا، اور آپس کی لڑائیاں بعض وقت معاشی ضرورت کے لیے برسہابرس ہوتی رہتی تھیں۔اس کے لیے ان کو ہر وقت تیار رہنا پڑتا تھا،اس ضرورت کے لیے ان کو اولاد کی کثرت اور جنگی سامان رکھنے کی ضرورت تھی، جس میں گھوڑوں کا کردار بہت اہم تھا۔اچھے سے اچھا گھوڑا جو جنگ میں چستی وچابکدستی میں ممتاز ہوان کو دوسری محبوب چیزوں سے بھی زیادہ عزیز ہوتا اور گھوڑے کی خوبیوں پر فخر کرتے تھے۔جنگ میں اپنی اور گھوڑے کی کارگزاری ان کی مجلسوں کو گرما دیتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت پر آمادہ کرنے کے سلسلے میں ان کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے اپنے معجزانہ انداز میں سورہ ''العادیات'' میں بات کہی کہ تیز دوڑنے والے گھوڑوں کی قسم جن کی تیزی اور برق رفتاری ایسی کہ ان کی ٹھوکروں سے چنگاریاں اڑیں اور منہ میں تھوک بھر جائے اور وہ صبح ہوتے ہوتے دشمن پر حملہ آور ہوجاتے ہیں اور ان کے قدموں سے غبار اڑنے لگتا ہے، اور دشمن کے مجمع کے بیچ میں پہنچ جاتے ہیں۔اسی طرح ان کے ذہنوں اور دلوں کو موہ لیتے ہوئے اور طبیعتوں میں شوق کو ابھارتے ہوئے فرمایا کہ انسان بھی کتنا ناشکرا ہے اور وہ اپنی ناشکری کو خود بھی اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور سمجھ رہا ہے یعنی ایسے دلچسپی اور شوق کے حالات اور سامان حسن عطا کیے اس پر بھی وہ اس کی اطاعت اور شکرگزاری کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور انسان فائدے کی طلب میں بہت آگے چلا جاتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھائے جائیں گے اور ان لوگوں کے کرتوت سامنے لائے جائیں گے اس وقت اللہ تعالیٰ سمجھ لے گا۔

﴿ وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحاً، فَالْمُورِيَاتِ قَدْحاً، فَالْمُغِيرَاتِ صُبْحاً، فَأَثَرْنَ بِهِ نَقْعاً، فَوَسَطْنَ بِهِ جَمْعاً، إِنَّ الْإِنسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ، وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ، وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ، أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ، وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ، إِنَّ رَبَّهُم بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ ﴾ (سورہ عادیات:۱-۱۱)

خود اپنے ہاتھ سے تراشے مجسموں کو خدا سمجھ کر ان کی عبادت کیے جانے کا تذکرہ ایسے نفسیاتی انداز میں اور نفسیاتی ترکیب کے ساتھ کرتے ہوئے سورہ حج میں فرماتا ہے کہ اے لوگو! یعنی شکر نہ کرنے والو بیشک جس کو تم اپنی حاجت کے لیے خدا سمجھ کر پکارتے ہو اللہ کو چھوڑ کر ان کا تو حال یہ ہے کہ مکھی جیسی حقیر چیز کو پیدا نہیں کر سکتے اور پھر اگر یہ سب مل کر بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ پیدا کرنا تو بڑی بات، مکھی ان کی مٹھائی کو کھانے لگے یا اٹھالے جائے تو اس کو چھڑا بھی نہیں سکتے۔ان سے مانگنے والے اور جن سے مانگ رہے ہیں کتنے کمزور ہیں اور یہ پروردگار عالم اللہ تعالیٰ کے مقام کو نہیں سمجھتے۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَن يَخْلُقُوا ذُبَاباً وَلَوِ اجْتَمَعُوا لَهُ وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئاً لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ، مَا قَدَرُوا اللَّهَ حَقَّ قَدْرِهِ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴾ (سورہ حج:۷۳-۷۴)

ان آیتوں میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ذہن کو مطمئن کرنے میں نفسیاتی خصوصیت کا بڑا لحاظ رکھا گیا ہے کہ انسان نے اپنی بنائی ہوئی چیز ہی کو معبود بنالیا ہے جو اتنی بھی طاقت نہیں رکھتی کہ ایک مکھی جیسی کمزور چیز کو اپنے سے ہٹا سکے، اور اپنے رب کریم کو نظر انداز کر دیا جو عظیم اور قادر مطلق ہے اور اسی نے پوری کائنات بنائی، اور جس کو جیسا چاہا بنایا اور اس میں جیسی طاقت اور استطاعت رکھنا چاہی ویسی رکھی۔ اور یہ بت جن کو یہ پوجتے ہیں، وہ تو مکھی کیا پیدا کر سکتے ہیں، مکھی اگر ان کی کھانے کی کوئی چیز لے لے تو وہ اس سے واپس لینے کی استطاعت بھی نہیں رکھتے۔ پھر فرمایا کہ دیکھو ان کے اختیار کردہ معبودوں سے مانگنے والے کتنے کمزور ہیں۔ قرآن میں انسان کی نفسیات اور متاثر ہونے کی جو کیفیات ہیں، اس کے لیے کتنے مؤثر حوالوں سے بات کو پیش کیا گیا ہے کہ بات دل میں اتر جائے اور انسان نے جو رسم اور جہالت میں اپنے ذہن سے افسانے بنا رکھے ہیں اس کا طلسم پاش پاش ہو جاتا ہے۔ یہ قرآن مجید کا اعجاز ہے۔ قرآن مجید میں قارئین اور سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی حیثیتوں کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، مثلاً سربلندی کے لیے الگ الگ مضمون اختیار کرنے والا لفظ، جب رضائے الٰہی کے خلاف ہونے کے لحاظ سے استعمال کیا جیسے فرعون تو ''علا'' کا لفظ اختیار کیا جس کا ماضی علا، اور مضارع یعلو ﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ﴾ یعنی فرعون نے سربلندی اختیار کی، اس میں اس کا اشارہ ہے کہ نافرمانی اور ظلم کے ساتھ علا في الأرض استعمال کیا ہے جس کا مصدر علو اور فاعل عالی ہے، لیکن اسی لفظ کو رضائے الٰہی کی خصوصیت والے مفہوم میں استعمال کیا تو علا سے علي استعمال کیا ہے جس کا مصدر علاء اور فاعل علی ہے۔

قرآن کریم کے مضامین کے بیان میں دل و دماغ دونوں کو سامنے رکھ کر بات کہی گئی ہے کہ اس کے سننے پر آدمی تأثیر سے مبہوت ہو جاتا ہے، اور اس کی بات کا پورا قائل ہو جاتا ہے۔ جیسا حضرت عمر کے اسلام لانے کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور جیسے حضور کی گفتگو کے موقع پر قرآن کی آیات کا اثر ہوا۔ قرآن کا یہ معجزاتی انداز دعوتی کام کرنے والوں کے سامنے بہترین نمونہ سامنے لاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صحیفہ سماوی ایک نہایت بیش بہا نعمت ہے جو اہل زمین کو میسر ہوئی ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ زمین پر اللہ کی کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جس نے آسمانی پیغام اور کلام سماوی سے وہ فائدہ اٹھایا ہو جو قرآن مجید سے اٹھایا گیا، چونکہ یہ آسمانی کلام ایسی طاقت کا حامل ہے جو سماوی طاقت ہونے کے باعث زمینی برداشت سے اوپر ہے، لیکن اللہ رب العزت نے آسمانی طاقت کے حامل کلام کو اپنی قدرت اور حکمت سے انسانی زبان کے مظہر میں نازل فرمایا، یہ زبان نزول قرآن کے زمانے میں انسانی ضروریات اور تقاضوں کو اچھے طریقے سے پورا کرنے کی اہل ہو چکی تھی اور اس زبان والوں کی اس کو سمجھنے کی صلاحیت بہت اچھی بن چکی تھی، یہی وجہ ہے کہ اس زبان کے ذریعے بنی نوع انسان کے لیے کلام ربانی کا فہم و ادراک اور استفادہ کا راستہ بہت ہموار ہو گیا۔

کلام الٰہی کی عظمت اور انسانوں کے لیے اس کی ضرورت کی طرف خود اللہ رب العزت نے ان الفاظ میں

اشارہ فرمایا ہے:

﴿ لَوْ أَنزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَى جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعاً مُّتَصَدِّعاً مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ○ ﴾

(سورہ حشر:۲۱)

''اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ خدا کے خوف سے دبا اور پھٹا جارہا ہے اور ہم اس کی مثالوں کو لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ غور کریں اور سمجھیں۔''

پھر قرآن پاک کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی، اس آیت سے انسان کی اعلیٰ ترین صلاحیت یعنی علم سے کام لینے کا حوالہ دیا گیا ہے، علم کی صلاحیت زبان کے ذریعے ہی انسانوں کو حاصل ہوتی ہے اور علم کی بدولت زمین پر موجود تمام مخلوقات میں انسان کو امتیازی شان اور فوقیت حاصل ہوئی ہے، اور علم رب العالمین کا وہ عطیہ ہے جس سے انسان مادی اور معنوی زندگی میں ہمہ جہتی ترقی کے لیے استفادہ کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی اس کا محتاج رہیگا۔

قرآن مجید جن عظیم خصوصیات اور بے شمار فوائد کی حامل کتاب ہے، ان میں انسان کی ہدایت اور انہیں تاریکی سے روشنی کی طرف لانے کو سرفہرست رکھا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

الٓرٰ ○ كِتَابٌ أَنزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِ رَبِّهِمْ إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ○

[ابراہیم:۱]

''یہ ایک پرنور کتاب ہے، اس کو ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے کہ لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ (یعنی) ان کے پروردگار کے حکم سے غالب اور قابل تعریف مقدس ذات کے رستے کی طرف۔''

اللہ رب العزت کائنات میں موجود ہر چیز کا پیدا کرنے اور اس کو اس کے مقصد کے لحاظ سے کام پر مامور کرنے والا ہے، اس طرح وہ ہر چیز سے واقف ہے، وہ انسانی طبیعت اور اس کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہے، وہ انسان کے اندر موجود خیر و شر کے پہلوؤں کو بھی خوب جانتا ہے، وہ انسان کے ظاہری و باطنی احوال سے بھی باخبر ہے، غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسانی مزاج، ضروریات زندگی اور اس کے تمام تر تقاضوں کا لحاظ رکھتے ہوئے انسانوں کو مخاطب کیا ہے، چنانچہ اس نے اس کی ہدایت کے لیے اس زبان کا انتخاب فرمایا جو براہ راست مخاطب لوگوں کی جانی پہچانی زبان تھی حتی کہ ان کے ان پڑھ کو بھی اس کے سمجھنے کی صلاحیت حاصل تھی، اس زبان کے الفاظ ،اسلوب بیان کا جوان کی انسانی فہم و ادراک کے عین مطابق ہیں، قرآن مجید میں لحاظ ہے، اور وہ انسان کی نفسیات اور عقل و فہم کو اپیل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک بیک وقت دل و عقل دونوں کے ساز کو چھیڑتا اور متاثر کرتا ہے، اس کی یہ تاثیر معجزاتی تاثیر ہے، کسی بھی انسانی کلام کے اسلوب و بیان میں

یہ تأثیر نہیں پائی جاتی اور نہ آج تک تاریخ اس کی نظیر پیش کر سکی ہے، اس طرح قرآن پاک ایک سراپا معجزہ ہے کہ اس جیسا مرتب کرنا کسی ماہر سے ماہر صاحب زبان کے بس میں نہیں ہے اگر چہ اس کا مطلب سمجھ سکنا اور حسب استطاعت اس سے فائدہ اٹھانا انسانی عقل وفہم سے ماورا نہیں ہے، لوگ اسے پڑھتے اور سمجھتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ ﴾

(العنکبوت:۴۳)

''اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں اور اسے تو اہل دانش ہی سمجھتے ہیں''۔

انسان پر یہ کتاب اس عظیم مقصد کے تحت نازل کی گئی ہے جو دنیوی، مادی اغراض سے کہیں بالاتر ہے، اس میں ایک طرف ضلالت وگمراہی سے ڈرانے اور اس کے برے انجام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، دوسری طرف پروردگار عالم کی عظمت وقدرت کی نشانیوں کا تذکرہ ملتا ہے اور اس زمین پر انسان کا جو عظیم کردار ہوسکتا ہے اس کی طرف متوجہ کیا گیا ہے اور اس سے انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کا سمجھنا اس کی علمی صلاحیت کی بنیاد پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے بطور خاص اس کو دی گئی ہے، آسان ہوجاتا ہے۔

بہر کیف قرآن پاک اسلوب بیان و بلاغت کلام کے مختلف اصناف پر مشتمل ہے، اسی کے ذریعے ان آیتوں کا فہم وادراک بھی آسان ہوجاتا ہے اور اس کے ادراک میں کائناتی وطبیعاتی دلائل معاون ثابت ہوتے ہیں، اسی زمرے میں سابقہ امتوں میں قصے ان کی زندگی کے احوال بھی آتے ہیں اور علم مغیبات انسان کو ہدایت پانے میں تعاون کرتا ہے اور یہ اس کا محض یہ ایک پہلو ہے جو موضوع سے ملتا جلتا ہے۔

جہاں تک اس کے اس پہلو کا تعلق ہے جو ظاہری کلام اور ادائے معانی کی خوبصورتی ودلآویزی سے عبارت ہے ،وہ بھی وصف اعجاز سے خالی نہیں چونکہ اس میں مؤثر الفاظ، اسلوب بیان میں تنوع اور مسحور کن فصاحت و بلاغت ان عرب فصحاء کلام کی نظر میں جن کے عہد میں یہ کلام نازل ہوا اور جن کا وہم وگمان تھا کہ ان کی زبان فصاحت و بلاغت کی بلند چوٹیوں پر ہے، لیکن جب انہوں نے قرآن پاک سنا تو حیران وششدر رہ گیے، جب کلام الٰہی نے ان کو چیلنج کیا تو قرآنی اعجاز اور فصاحت و بلاغت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے، چنانچہ سابقہ امتوں کے احوال وواقعات کے ذکر میں جو مؤثر اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور جنت ودوزخ وروز قیامت کی جو منظر نگاری کی گئی ہے، اپنی مثال آپ ہے، منظر کشی ومنظر نگاری کا اس سے بہتر اور کوئی مؤثر طریقہ نہیں ہوسکتا، پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں پر رعب ودبدبہ طاری ہوجاتا ہے۔

جہاں تک تصویر کشی کے اسلوب کا تعلق ہے تو وہ تمام دلوں کا احاطہ کرتا نظر آتا ہے، اسی طرح مختلف مواقع اور حالات کی مناسبت سے الفاظ کے استعمال میں زبردست تنوع پایا جاتا ہے مثلاً لفظ ''ریح'' قرآن نے واحد کے طور پر استعمال کر کے اس کے معنی عذاب وہلاکت کے لیے، جیسا کہ قوم عاد کے قصے اور دیگر مواقع پر آیا ہے، لیکن جب اسی لفظ کو جمع کے

طور پر استعمال کیا گیا تو اس کے معنی خیر و عافیت کے سبب کے ہو گیے، اس کا استعمال پودوں و نباتات کے فائدے کے لیے بارش برسانے کے ذکر میں ملتا ہے، ٹھیک اسی طرح لفظ 'نعمۃ' کو دیکھیے کہ جب اس کا استعمال نون کے زیر کے ساتھ کیا تو اس سے افادہ اور خیر کے وصف کے لیے کیا گیا اور مومن بندوں کے لیے رحمت کے طور پر لیا لیکن جب اسی لفظ کا استعمال نون کے زبر کے ساتھ کیا تو اس کے معنی ان امور کے لیے گیے ہیں جن کے ظاہر میں خیر و فلاح ہے اور اس کے باطن میں اللہ کا غضب اور عذاب ہے۔ جیسے کافروں اور خالص دنیا پسندوں کے لیے فرمایا ﴿وَنَعْمَةٍ كَانُوا فِيهَا فَاكِهِينَ﴾ اسی طرح ''خطأ'' کا لفظ ہے، دنیاوی معاملات کے لیے ثلاثی مجرد اور دینی معاملات کے لیے ثلاثی مزید فیہ کے صیغے استعمال کیے گیے ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

اس کے علاوہ الفاظ کے استعمال میں صوتی رعایت کا بھی زبردست تناسب ملتا ہے جیسا کہ سورہ مریم کے آخر میں 'تکاد السموات یتفطرون منه' و 'تنشق' میں معانی کی مناسبت سے صوتی مطابقت بھی خوب پائی جاتی ہے، چنانچہ ان الفاظ کی آوازان کے معانی کے وقوع پر منطبق ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے اسی کلام مجید میں جو عظیم ترین بھی ہے اور بلیغ و مبین بھی اور ہدی للعالمین بھی ہے، وہ باتیں بیان کی ہیں جو اس ساری کائنات کے بنانے و ساری مخلوقات کو پیدا کرنے والے واحد خالق اور رب کو اپنا رب ماننے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی تاکید کرتی ہیں، اور انسانوں کی سیرت و اخلاق اور ان کے اچھے اور برے استعمال کے نتائج کو بھی متعین کرتی ہیں، اور ان کو مؤثرانہ دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور چونکہ انسانوں کے خالق و مالک نے انسان کو اس کرۂ ارض پر اپنی عبادت اور بطور خلیفۃ اللہ في الأرض صحیح و بلند و بالا کارکردگی کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کے لیے اپنی رائے اور پھر رائے کے مطابق طریقۂ عمل اختیار کرنے کی صلاحیت دی ہے تاکہ انسان اپنے پیدا کیے جانے کے مقصد کو پورا کر سکے اور اس کے لیے موت کے بعد دوسری زندگی رکھی ہے تاکہ دنیاوی زندگی میں اس نے جو عمل کیا ہے اس کو اس کا بدلہ وہاں مل جائے اور اچھے عمل کی صورت میں اپنے خالق و مالک کی طرف سے بہتر سے بہتر انعام اور صلہ حاصل کر سکے، اس لیے اس کی رہنمائی کے لیے اچھے اور برے کام کے فرق کی وضاحت پر مشتمل معلومات اس نے اپنے نبیوں کے ذریعہ انسان کو بتائی ہیں اور صحیح طریقۂ کار اختیار کرنے کی طرف متوجہ کرنے کے لیے تلاوت کی جانے والی وحی کے ذریعہ اپنی کتاب قرآن مجید انسانوں کو عطا فرمایا، وہ پڑھے جانے کے لحاظ سے ''القرآن'' کہلایا۔

بہرحال یہ کتاب کتاب الٰہی ہونے کی بنا پر آسمان کے اوپر سے رب العالمین نے اتاری ہے۔ اس طرح اس کا اوپری سرا رب العالمین سے ملا ہوا ہے اور دوسرا سرا خصوصی طور پر انسان کے فائدے کے لیے نیچے اتارا گیا۔ زمین سے بنے اور اس میں بسے ہوئے انسانوں میں سے جو ایمان رکھنے والے ہوں ان تک پہنچایا گیا ہے۔ اس طرح وہ اوپر رب العالمین سے وابستہ ہے اور دوسری طرف اس کو نیچے کی طرف زمینی مخلوق کے آسمانی عمل رکھنے والوں کے لیے استفادہ کے قابل کر دیا

ہے، اس طرح انسانوں کے لیے آسمانی کتاب اور اس کے مقدس معانی ومضامین کو رب العالمین نے زمینی مخلوق کے لیے بہترین زبان کا لباس دے کر زمینی مخلوق انسان کی ہدایت کا ذریعہ بنادیا۔

اس کے معانی ومضامین تو وہی رکھے گیے جن کا انسان کو جاننا انسان کے رشد وہدایت کے لیے ضروری ہے اور جن کے ذریعے انسان کو اپنے خالق ومالک کی عظمت ونعمت کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ پھر اس کا بیان اور حسن تعبیر جس کے ذریعے ان کو سمجھنا اور ان پر عمل کرنا ہے، زمینی انسان کی صلاحیت فہم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے سمجھنے کا پہلو جو زمینی پہلو ہے اس کی رعایت میں رب العالمین نے اس کو انسانی الفاظ کا لباس عطا کیا تا کہ انسان سمجھ سکے اور اس کے سننے پر وہ بات بلا تردد سامع وقاری کے دل ودماغ میں اتر جائے، خاص طور پر قرآن مجید کے نزول کے زمانے میں بار بار پیش آیا کہ جس مخالف نے بھی چند آیات بھی کھلے ذہن سے سنیں فریفتہ ہوگیا اور ایمان لے آیا کہ ایسا عظیم الشان اور مؤثر کلام رب العالمین ہی کا کلام ہوسکتا ہے جس کا ڈھالنا کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اس کو بنا سکے۔ چنانچہ خود قرآن نے سب کو چیلنج کیا کہ تم اگر اس کو انسان کا کلام سمجھتے ہو تو ایسا کچھ بنا کر لاؤ۔ اس طرح یہ قرآن مجید زمین کی صلاحیت برداشت سے بلند وبالا اور آسمانی تقدس کا حامل ہونے کے ساتھ انسانی فائدے اور اس کے رشد وہدایت کے لیے زمینی مادے سے پیدا کی گئی اشرف المخلوقات کے لیے قابل استفادہ بنادیا گیا۔

اس کے بلند وبالا مضامین کو انسانی دل ودماغ میں اتار دینے کے لیے آسان اور بات کو واضح طریقے سے بیان کرنے والا بنایا گیا اور دل میں اتر جانے والے الفاظ میں پیش فرمایا گیا، لہٰذا اس کو صفت مبین سے موصوف کیا گیا اور فرمایا گیا:

﴿ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۝ ﴾ [سورۃ القمر:۱۷]

''اور ہم نے قرآن کو آسان کیا ہے، تو ہے کوئی جو اس سے نصیحت حاصل کرے''۔

قرآن مجید میں جو ابدی اور دائمی صحیفۂ ربانی ہے، اعجاز و اقناع اور مؤثر اسلوب بیان کی تمام شرائط اور خصائص بدرجۂ اتم موجود ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے دلوں پر بڑا گہرا اثر ڈالا، شکوک وشبہات کا ازالہ کیا، ذہنوں کو مطمئن کیا اور لوگوں کو برضا ورغبت حق کی اتباع اور الٰہی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کیا، پوری تاریخ انسانی میں قرآن جیسا مؤثر اور بلیغ کلام نہیں ملتا، قرآن مجید کی اس حیرت انگیز تاثیر کی درج ذیل خصوصیات ہیں:۔

(۱) انسانی ذہن ودماغ اور تفکیر وشعور سے اس کی فطری ہم آہنگی۔

(۲) واضح، روشن دلائل اور تشفی بخش طرز استدلال۔

(۳) عقیدہ وسلوک کے سلسلے میں نفس انسانی کی مکمل رعایت اور وجود انسانی کی صحیح اور مناسب تفسیر وتوضیح۔

(۴) انسانی خواہشات اور تقاضوں کی فطرت سلیمہ کے حدود میں رہتے ہوئے تکمیل۔

قرآنی بلاغت ہی اعجاز قرآن کا راز ہے، اور ترسیل

واقناع کا ذریعہ ہے،اور یہی وہ ذریعہ ہے جس سے اقناع اور امتاع کی شرائط کا تحقق ہوتا ہے،قرآن مجید اپنی بلاغت عالیہ کے ساتھ نفس انسانی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔انسان کو قرآن کی ہر ہر آیت اور ہر ہر لفظ میں بلاغت عالیہ کا مشاہدہ ہوتا ہے، چنانچہ وہ انسانی قلب ونظر اور شعور وجدان کو بیک وقت مخاطب کرتا ہے اور ان پر اپنے ساحرانہ اور مؤثر اسلوب بیان سے اثر انداز ہوتا ہے۔وہ نفس انسانی کے تمام پہلوؤں کو مہمیز کرتا ہے،اور ہر پہلو میں روح کی بالیدگی اور نشاط پیدا کرتا ہے،کسی پہلو کو معطل اور نظر انداز نہیں کرتا، وہ نفس انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے مجرد عقلی دلائل پر اکتفاء نہیں کرتا اور نہ ہی انسانی وجدان اور شعور پر اثر انداز ہونے والے ذرائع کا سہارا لیتا ہے،جیسا کہ انسان کرتا ہے، بلکہ قرآن انسانی صلاحیتوں کا خیال رکھتے ہوئے اسلوب وانداز اختیار کرتا ہے،تاکہ مختلف المزاج اور مختلف الفکر لوگوں کو یکساں مطمئن کر سکے۔قرآن مجید کا سب سے بڑا اعجاز دراصل اس کا یہی عام فہم اور مؤثر اسلوب بیان ہے،اس لیے کہ مختلف المزاج،مختلف الفکر اور مختلف المشرب لوگوں کی بیک وقت رعایت وہی کر سکتا ہے جو نفس انسانی کے مزاج اور اس کے دلوں کے بھید سے واقف اور باخبر ہے۔

جس طرح قرآن مجید تمام انسانوں کو مطمئن کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے،ٹھیک اسی طرح اس میں بیان وبلاغت اور حسن تعبیر کے تمام عناصر بھی بدرجۂ اتم واکمل موجود ہیں اور اظہار وبیان کے یہی وہ عناصر ہیں جو اسے عقل ودل اور فکر وشعور پر بیک وقت قابو اور کنٹرول عطا کرتے ہیں،ان تمام عناصر کا ظہور اس کے معانی ومطالب کی صحت ودقت، دلکش اور متنوع انداز بیان ، بے نظیر موسیقیت ونغمگی میں ہوتا ہے، یہ عناصر بیان قرآن کے علاوہ کسی اور کتاب یا کسی اور کے کلام میں نہیں ملتے،اس باب میں اس کا کوئی ہمسر وثانی نظر نہیں آتا۔

یہی وجہ ہے کہ علماء دین نے بلاغت کے امتیازات و خصائص کو بیان کرنے کے لیے متعدد کتابیں تالیف کی ہیں،ان میں وہ بھی شامل ہیں جن میں الفاظ اور معانی میں قرآنی اعجاز کا ذکر ملتا ہے اور وہ بھی ہیں جو ان خبروں پر مشتمل ہیں جو نزول قرآن کے بعد ظاہر ہوئے اور موقع بہ موقع یوں ہی ظاہر ہوتا رہے گا،ان میں کچھ ایسے ہیں جو استدلال کے مختلف اصناف پر مشتمل ہیں اور بعض کائنات وطبیعیات سے تعلق رکھتے ہیں اور بعض ان واقعات سے متعلق ہیں جو سابقہ امتوں کے ساتھ پیش آئے جیسا کہ اس میں مؤثر احکام وامثال پائے جاتے ہیں۔

قرآن مجید میں معنوی اور لفظی دونوں لحاظ سے انسانی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اعلیٰ انداز کلام اور انسانی نفسیات کی رعایت اختیار کی گئی ہے اور اس کی آیات پر غور وتدبر سے ایسے نکتے سامنے آتے ہیں کہ غور کرنے والے کو حیرانی ہو جاتی ہے اور قرآن مجید کے معجزہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے اور اسی لیے قرآن مجید کو جو بھی کھلے دل سے پڑھتا ہے وہ متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا اور اس پر ایمان لے آتا ہے اور آمنا وصدقنا کہتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کو راہ راست پر لانے کے سلسلے میں سب سے بڑا رہبر اور تابناک مشعل راہ ہے۔☆☆☆

قرآن مجید کا اعجاز بیانی

اور قرآنی اسلوب میں دینی اور فنی مقاصد کا حسین امتزاج

(مولانا) سید محمد واضح رشید حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ

قرآن کریم صحف سماویہ میں اپنی خصوصیات کے اعتبار سے منفرد کتاب الٰہی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا تحریف سے محفوظ رہنا ہے، وہ صوتی، لفظی اور ترتیب کے اعتبار سے محفوظ ہے۔ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جو اس خاص امتیاز کی طرف اشارہ کرتا ہے ﴿ إنا نحن نزلنا الذكر وإنا له لحافظون ﴾ [سورہ حجر ع:۱] (بیشک ہم نے قرآن نازل کیا، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب قیامت تک اپنی خصوصیات کے ساتھ محفوظ اور قابل استفادہ رہے گی۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی'' میں تحریر فرمایا ہے:

''قرآن ''فرقان'' (فاروق اور ممیز) ہے اور یہ اس کی ایسی امتیازی صفت ہے جو اس کے نام کے قائم مقام ہوگئی ہے ﴿ تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ﴾ [سورہ فرقان:۱] (بڑی عالیشان ذات والا ہے جس نے یہ فیصلے کی کتاب اپنے بندۂ خاص پر نازل فرمائی، تاکہ وہ تمام دنیا پر جہاں والوں کے لیے ڈرانے والا ہو) قرآن مجید نے ہدایت و گمراہی میں، ایمان وکفر میں، اسلام اور جاہلیت میں، خدا کی رضا وعدم رضا میں، یقین وظن میں، حلال وحرام میں، قیامت تک کے لیے جو فصل اور امتیاز پیدا کردیا ہے اس کی نظیر سے مذہبی تعلیمات اور آسمانی صحیفوں کی تاریخ خالی ہے''۔

قرآن کریم اپنی زبان وبیان اور مضامین کے اعتبار سے ہر زمانے میں بحث وتحقیق کا موضوع رہا ہے، اس لیے کہ وہ عربی میں نازل ہونے کے باوجود ہر دور اور ہر قوم کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ﴿ لَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴾ [سورہ انبیاء:۱۰] (ہم نے تمہاری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے جس میں تمہارا تذکرہ ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔) دوسری جگہ ارشاد ہے ﴿ وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ﴾ [سورہ اعراف:۵۲] (اور ہم نے ان کے پاس کتاب

پہونچادی ہے، جس کو علم ودانش کے ساتھ کھول کھول کر بیان کردیا ہے، اور مؤمن لوگوں کے لیے ہدایت ورحمت ہے۔ ایک دوسری خصوصیت کی طرف اشارہ اس طرح کیا گیا ہے: ﴿الر تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْمُبِينِ إِنَّا أَنزَلْنَاهُ قُرْآناً عَرَبِيّاً لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ﴾ [سورہ یوسف:۱-۲] یہ کتاب روشن کی آیتیں ہیں، ہم نے اس قرآن کو عربی میں نازل کیا، تاکہ تم سمجھ سکو۔

قرآن کتاب ہدایت، بشارت اور رحمت ہے اور ہر چیز کی تفصیل بیان کرنے والی کتاب ہے۔ ﴿إِنَّ هَـذَا الْقُرْآنَ يِهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ﴾ (اسراء: ۹) قرآن سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ﴿وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَاناً لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَى لِلْمُسْلِمِينَ﴾ (نحل: ۸۹) اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جس میں ہر چیز کی تفصیل ہے، اور مسلمانوں کے لیے کتاب ہدایت ورحمت اور بشارت ہے۔

عربوں کو چونکہ فصاحت وبلاغت کا دعوی تھا اور یہ ان کا امتیاز تھا، وہ دوسری قوموں کو عجمی سمجھتے تھے اور وہ قرآن کریم کے مخاطب اول تھے، اس لیے قرآن کریم نے ان کو اس بنیاد پر چیلنج کیا کہ وہ اس سے بہتر نمونہ لاکر دکھائیں، وہ اس میں ناکام رہے، بلکہ ان کے اہل علم وذوق نے اس کے معجز ہونے کا اقرار کیا۔ ولید بن مغیرہ جو حضور (ﷺ) کے دشمن تھے، آپ کو قرآن کریم کی بعض آیتیں تلاوت کرتے ہوئے سنیں تو اتنا متأثر ہوئے کہ وہ بھاگے ہوئے قریش کے بعض سرداروں کے پاس آئے اور کہا کہ: ''واللہ لقد سمعت من محمد کلاماً ما ھو من کلام الإنس، ولا من کلام الجن، وإن لہ لحلاوۃ، وإن علیہ لطلاوۃ، وإن أعلاہ لمثمر، وإن أسفلہ لمغدق'' (خدا کی قسم میں نے محمد (ﷺ) کو ایسا کلام پڑھتے سنا ہے کہ جو نہ تو انسانوں کا کلام ہوسکتا ہے اور نہ جنات کا، اس میں تو بڑی مٹھاس اور بڑا بانکپن اور دلکشی ہے، اس کا اوپری حصہ (یعنی ظاہری الفاظ) بڑا پھلدار (بڑا سامعہ نواز اور حسین) اور اس کا نچلا حصہ بہت زیادہ پانی والا ہے (یعنی معانی اور مطالب کے لحاظ سے بہت دقیق اور گہرا ہے)۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کا بنیادی اعجاز اعجاز بیانی قرار پایا۔

قرآن کریم اعجاز بیانی کے ساتھ رشد وہدایت، علم وفکر، اخبار بالغیب، امم سابقہ کا تذکرہ، غلط تصورات اور معتقدات کی تصحیح، خلق انسان اور کائنات کے اسرار اور خدا کی مخلوقات کی خصوصیات، طبیعت انسانی کے رجحانات، اور صلاحیتوں، اعمال انسانی کے نتائج اور اثرات اور اس طرح کے انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کے بارے میں رہنمائی کرنے والی کتاب ہے۔

ان مختلف اور متعدد خصوصیات کی وجہ سے قرآن کریم پر ہر دور میں اہل علم نے اپنے اپنے زاویوں سے کام کیا، ابتدائی دور بیان کا تھا، اس لیے کہ عربوں کا یہ امتیاز تھا، اس لیے قرآن کریم کے اعجاز بیانی پر زیادہ کام ہوا، اور اس موضوع پر ایک کتب خانہ تیار ہوگیا اور اس کا سلسلہ اس عہد تک جاری ہے۔

اس سلسلے میں ابن قتیبہ کی کتاب "تأویل مشکل القرآن"، ابوالحسن اشعری کی کتاب "مقالات الإسلامیین"، ابوالحسن خیاط کی کتاب "الانتصار"، ابوعبیدہ کی کتاب "مجاز القرآن"، فراء کی کتاب "معانی القرآن"، جاحظ کی کتاب "نظم القرآن"، ابوبکر عبداللہ سجستانی (متوفی ۳۱۶ھ) کی کتاب "نظم القرآن"، ابوعبداللہ محمد بن زید واسطی معتزلی (متوفی ۳۰۶ھ) کی کتاب "اعجاز القرآن"، ابوبکر باقلانی (متوفی ۴۰۳ھ) کی کتاب "اعجاز القرآن"، ابن عربی کی "اعجاز القرآن"، ابوالحسن علی بن عیسی رمانی (۳۸۴ھ) کی کتاب "النکت في اعجاز القرآن"، ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی کی کتاب "بیان اعجاز القرآن"، قاضی ابوالحسن عبدالجبار معتزلی کی کتاب "اعجاز القرآن"، عبدالقادر جرجانی کی کتاب "دلائل الإعجاز" اور "أسرار البلاغة"، فخرالدین رازی کی کتاب "نهایة الإیجاز في دراية الإعجاز" ابن ابی اصبع مصری کی کتاب "بدیع القرآن"، یحی بن حمزہ علوی کی کتاب "الطراز في أسرار البلاغة وعلوم حقائق الإعجاز"، برہان الدین بن عمر بقاعی (متوفی ۸۸۵ھ) کی کتاب "نظم الدرر"، جلال الدین سیوطی کی کتاب "الاتقان في علوم القرآن"، اور کتب تفاسیر میں جاراللہ زمخشری کی کتاب "الکشاف" بیش قیمت سرمایہ ہے۔

زبان وادب کے ماہرین ابن قتیبہ، جاحظ، ابوعبداللہ مبرد نے کتاب اللہ کی زبان وبیان پر کتابیں لکھیں۔ غریب القرآن، مشکلات القرآن، مجاز القرآن، نظام القرآن پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ احکام القرآن پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔ امم خالیہ کے قصوں پر قصص القرآن کے نام سے متعدد کتابیں لکھی گئیں۔

تفسیر پر جو کتابیں لکھی گئیں، وہ صاحب تفسیر کے رجحان کے اعتبار سے ہیں اور ہر کتاب چاہے وہ متقدمین کی ہو، یا متأخرین کی، زمانہ اور صاحب کتاب کی اپنی فہم، اور ذوق کے اعتبار سے ہے، اور ہر تفسیر اپنی ایک خصوصیت رکھتی ہے۔

إعراب القرآن پر متعدد کتابیں تصنیف کی گئیں۔ اس اعتبار سے قرآن کریم کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہر دور میں رہا ہے، اور علمی، ادبی اور دینی حیثیت سے اہل علم کو اس موضوع سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اس طرح عربی کے علاوہ مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں بھی قرآن کریم کے مختلف موضوعات اور خصوصیات کے اعتبار سے کتابیں تصنیف کی گئیں، فارسی اور اردو زبانوں کا عربی زبان کے بعد تیسرا حصہ رہا ہے۔

قرآن کریم کے ترجمے بھی اسی تنوع کے ساتھ ہر دور میں ہوئے، اور اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے، ہندوستان میں فارسی اور علاقائی زبانوں میں ترجمے کیے گیے، اس دور میں یورپ کی مختلف زبانوں میں ترجمے کیے جارہے ہیں۔

یہ دور علمی ذوق کا ہے، اس میں بیان کو کم اہمیت دی جاتی ہے، اس لیے اس دور میں قرآن کریم کے اعجاز علمی پر متعدد اہل

علم کے قلم سے کتابیں شائع ہوئیں، اور مقبول ہورہی ہیں، کسی نے قرآن مجید کے تشریعی اعجاز پر قلم اٹھایا، کسی نے کائنات کے بارے میں قرآن کریم کے معجزانہ اسلوب پر بحث کی ہے، جیسے علامہ رشید رضا کی کتاب "الوحي المحمدي"، شیخ محمد ابو زہرہ کی کتاب "شرعية القرآن دليل على أنه من الله سبحانه وتعالى" اور مالک بن نبی کی کتاب "الظاهرة الكونية في القرآن" ہے، اور یہ کتابیں ہدایت کا سبب بن رہی ہیں۔

لیکن اعجاز بیانی وہ اعجاز ہے جس کا قرآن کریم نے خود دعوی کیا ہے اور اس پر چیلنج کیا ہے، اس لیے اس کے ساتھ اعجاز بیانی پر بھی کام جاری ہے۔ مصطفیٰ صادق الرافعی کی کتاب "إعجاز القرآن"، شیخ محمد عبداللہ دراز کی کتاب "النبأ العظيم"، سید قطب شہید کی کتاب "التصوير الفني في القرآن" اور "مشاهد القيامة في القرآن"، محمد الخضاوی کی کتاب "الفاصلة في القرآن" اور ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمن بنت الشاطی کی کتاب "الإعجاز البياني للقرآن" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

بعض مصنفین نے قرآن کریم کی دونوں خصوصیات پر توجہ کی ہے، اور انہوں نے قرآن کریم کے اسلوب بیان کی خصوصیات یہاں تک کہ صوتی آہنگ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ سید قطب شہید نے اس پہلو پر اپنی کتاب "التصوير الفني في القرآن" میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس پہلو پر کم لوگوں نے توجہ کی ہے کہ الفاظ اور معانی اور نظم کے علاوہ قرآن کریم کی آیات میں خاص طور سے بعض سورتوں میں صوتی اعجاز بھی پایا جاتا ہے، صرف اس کو سن کر لوگ اس کے کلام الٰہی ہونے کے قائل ہوئے ہیں اور اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔

عرب جو براہ راست مخاطب تھے، وہ عربی زبان کی تعبیر و بیان کے مختلف وجوہ سے واقف تھے، اس لیے وہ قرآن کریم کی چند آیات سنتے ہی اس کے کلام الٰہی ہونے کا اقرار کر لیتے تھے، چاہے وہ کتنے ہی مخالف ہوں۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "مطالعۂ قرآن کے اصول ومبادی" میں لکھتے ہیں:۔

"قرآن مجید صرف اپنے الفاظ وترکیب اور فصاحت وبلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی ومضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم ومعارف میں بھی، معلومات غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی واخلاقی ومعاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات وانقلابات میں بھی، اپنی پیشین گوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے، مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجاز کامل کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے کوئی مقابلہ نہیں ہوسکا تو اس کے اعجاز کامل میں کیا مماثلت ہوسکتی ہے؟"۔

قرآن مجید کا اسلوب بیان حسن تعبیر اور بلاغت کا اعلیٰ

شاہکار ہے، اس لیے کہ اس کا مقصد محض قصہ بیان کرنا اور تفریح یا علم میں اضافہ نہیں ہے، بلکہ بنیادی مقصد موعظت ہے، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے ﴿ لعلهم يتفكرون ﴾ بعض جگہ اس کے لیے ''ذکری'' کی تعبیر استعمال کی گئی ہے، اس لیے اس کا انداز ضرورت اور سیاق کے اعتبار سے ہے اور اس میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اس کے پیش کرنے کا طریقہ مختلف ہے، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:۔

''قرآن کریم نے دعوت کے لیے واقعات بیان کرنے اور مثالیں دینے کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ دوسرے وسائل دعوت کی بہ نسبت یہ طریقہ زیادہ زوداثر اور دلنشیں ہے اور مقصد کے حصول میں یہ طریقہ زیادہ مفید اور کارآمد ثابت ہوا ہے۔ ایک طرف قرآن کریم نے اگر تفصیلی ضابطے اور قانونی باریکیاں بتانے کو ضروری نہیں سمجھا ہے تو دوسری طرف اس خلا کو (اگر اس کو خلا سمجھا جائے جو درحقیقت خلا نہیں ہے) انبیاء کرام کی سیرت اور ان کے مواعظ اور دعوت پر مکالموں کے نمونوں سے پر کیا ہے۔ یہ نمونے دلوں پر اثر اندازی کی بے انتہا قوت رکھتے ہیں، ذہن وقلب پر ان کا سحر کی مانند اثر ہوتا ہے، کیونکہ عملی نمونوں کا جو اثر ہوتا ہے، وہ کسی دوسرے وسائل دعوت کا نہیں ہوسکتا، منطقی، نفسیاتی، علم کلام کے انداز کے جدلی اصول، دعوت کے لیے کارآمد عناصر نہیں ثابت ہوئے ہیں، تمام آسمانی صحیفوں نے شروع سے آخر تک عملی نمونوں پر اعتماد کیا ہے، یہ نمونے اور مثالیں ادبی شہ پارے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں''۔ (دعوت وتبلیغ کا معجزانہ اسلوب، ص:۲۴-۲۵)۔

بیان کے اعتبار سے اور قصہ کے اجزا کے انتخاب اور ترتیب کے اعتبار سے سید قطب شہید نے اپنی کتاب ''التصوير الفني في القرآن'' میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔ سید قطب شہید لکھتے ہیں:۔

''قرآنی قصہ (واقعہ نگاری) کی فنی خصوصیات میں پہلی چیز واقعہ کے طریقہ اظہار وبیان کا تنوع ہے۔ دوسری فنی خصوصیت طریق مفاجات کا تنوع ہے۔ واقعہ نگاری کی تیسری فنی خصوصیت وہ وقفہ اور خلا ہے جو ایک منظر اور دوسرے منظر میں پایا جاتا ہے، اس طرح ایک سین کے بعد وقفہ کرکے دوسرے منظر سے الگ کیا جاتا ہے۔ وقفے کے طرز کو جملہ قرآنی آیات میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس کی مثال حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں نمایاں طور پر ملتی ہے۔ قصے کی چوتھی فنی خصوصیت منظر کشی ہے، قرآن جو مشاہد ومناظر بھی پیش کرتا ہے، ان کی اس انداز سے منظر کشی کرتا ہے کہ اس کا سامع اور ناظر اس کو ماضی کا واقعہ یا حادثہ نہیں بلکہ زمانہ حال کا ایک واقعہ تصور کرتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہورہا ہے۔ قصے کے مشاہد ومناظر کی جو تصویر کھینچی جاتی ہے اس کے مختلف انداز واطوار ہیں، ایک رنگ تو وہ ہے جو کسی واقعہ کو پیش کرنے اور اس کو زندہ کرنے میں نمایاں ہوتا ہے، دوسرا رنگ جذبات واحساسات کی منظر کشی میں ظاہر ہوتا ہے اور تیسرا رنگ شخصیات

کی تصویر کشی میں ابھرتا ہے، یہ رنگ ہائے مختلفہ جداگانہ طور پر نہیں ہوتے ،بعض مواقع میں ان میں سے ایک رنگ نمایاں تر ہوکر دوسرے دورنگوں پر غالب آجاتا ہے، اوران کو پھر اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، حق بات تو یہ ہے کہ جملہ واقعات کے مناظر میں یہ تمام فنی رنگ ظاہر ہوتے ہیں ، اس کی مثال باغ والوں کا واقعہ، بنائے کعبہ کے وقت حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی کیفیت، حضرت نوح اوران کے بیٹے اور طوفان کا واقعہ، اور اسی طرح اصحاب کہف کا واقعہ۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کشی کی مثال حضرت مریم کا واقعہ ہے، اورقرآنی واقعات میں شخصیت نگاری کی مثال دو باغ والوں کا قصہ، حضرت موسی اور حضرت خضر کے واقعات شخصیت نگاری کے اعلی نمونے ہیں، اسی طرح حضرت ابراہیم، حضرت یوسف، حضرت آدم، حضرت سلیمان علیہم السلام کے تذکروں میں بھی شخصیت نگاری کے اعلی نمونے موجود ہیں''۔

قرآن مجید میں قصہ نگاری مقصود بالذات نہیں، قرآن نے جس طرح دینی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے دیگر ذرائع اختیار کیے ہیں، اسی طرح قصہ گوئی بھی ان میں سے ایک ہے، قرآن کا بنیادی مقصد دعوت دین ہے، اورقصہ گوئی یا قصہ نگاری دعوتِ دین کی تبلیغ وترسیل کا ایک ذریعہ ہے، لہذا قرآن جس طرح قیامت اوراخروی ثواب وعتاب کی منظر نگاری کرتا ہے، بعث بعدالموت اور قدرت خداوندی کے اثبات میں دلائل دیتا ہے، شریعت کی تفصیل بیان کرتا ہے، اورضرب الامثال بیان کرتا ہے، بالکل اسی طرح وہ اپنی دعوت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے واقعات بیان کرتا ہے۔

لہذا قرآن کے بیان کردہ واقعات اپنے موضوع، طرز ادا اور حوادث کے رونما ہونے کے اعتبار سے دینی مقاصد کے زیر اثر ہیں، مگر دینی مقاصد کے تابع ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واقعات کو پیش کرنے میں فنی خصوصیات کو بھی نظر انداز کردیا ہے، بلکہ دینی مقاصد کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ قرآنی واقعات فنی خصوصیات کے بھی حامل ہیں، خصوصا قرآنی تعبیر وبیان کی عظیم خصوصیت یعنی منظر نگاری تو اسکا لازمی حصہ ہے۔ سید قطب شہید قرآنی اسلوب میں فنی اور دینی مقاصد کے حسین امتزاج پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

''قرآنی اسلوب دینی وفنی اغراض ومقاصد کا حامل وجامع ہے، قرآن کے پیش کردہ صور ومشاہد میں دونوں اوصاف پوری طرح موجود ہیں، قرآن فنی حسن وجمال کو وجدانی تاثیر کے وسیلے کے طور پر استعمال کرتا ہے، اس لیے وہ وجدان کی دینی حس کو فنی حسن وجمال کی زبان میں مخاطب کرتا ہے، ظاہر ہے فن اور دین دونوں باہم لازم وملزوم ہیں، اوران کا قرار نفس انسانی اور حواس کی گہرائی میں ہے، جمال فنی کا فہم وادراک اس بات کی دلیل ہے کہ نفس انسانی میں دینی تاثیر کے اخذ وقبول کی استعداد موجود ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب فن اپنے اوج کمال کو پہنچا ہوا ہو، اوراس کے ساتھ ساتھ نفس حسن وجمال کے پیغام کو حاصل کرنے کے لیے تیار ہو''۔☆☆☆

امثالِ قرآنی کی بلاغت و معنویت

مولانا عبدالمصور خاں ندوی

تاریخ عالم کھلے منہ گواہی دے رہی ہے کہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں افقِ عالم پر کفر و شرک اور جہل و ضلالت کی گھنگھور گھٹائیں چھارہی تھیں۔ سطحِ ارض پر گھپ اندھیرا چھارہا تھا۔ ظلم و طغیان اور کفر و عصیان کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ زمین پر بسنے والے خاکی پتلے آسمان والے خدائے واحد کو بھول گیے تھے اور ایسے ڈھیٹ اور نڈر ہو گیے تھے کہ من مانی چال چلتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کو مسخ کر دیا گیا تھا۔ مصلحین کی اصلاحات پر قلم پھیر دیا گیا تھا۔

اشرف المخلوقات کی یہ زبوں حالت دیکھ کر غیرتِ حق کو حرکت ہوئی۔ دریائے رحمت جوش زن ہوا۔ خداوندِ ذو الجلال نے اپنے حبیب حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو وہ نسخۂ کیمیا عطا فرمایا جس نے مسِ خام کو کندن بنا دیا، جو قیامت تک کے لیے عالم کی تمام ظاہری و باطنی ضروریات کا کفیل ہے۔ اس کی ضیاباریوں سے عالم بقعۂ نور ہو گیا۔ خدائے واحد کے ذکر سے زمین و آسمان، دشت و جبل، بحر و بر گونج اٹھے اور علم و تہذیب، انصاف و دیانت کا سمندر موج زن ہو گیا۔ اور نبی امی پر ایک کتابِ ہدایت کو نازل کیا گیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

﴿ و إنه لتنزيل رب العالمين ، نزل به الروح الأمين ، على قلبك لتكون من المنذرين ، بلسان عربي مبين ﴾۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی'' میں قرآن کریم کے اعجازی پہلو کو واضح کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''قرآنِ مجید صرف اپنے الفاظ و ترکیب اور فصاحت و بلاغت ہی کے اعتبار سے معجزہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے الفاظ اور ترکیب میں بھی معجزہ ہے، اپنے معانی و مضامین میں بھی، اپنے اعلیٰ علوم و معارف میں بھی، معلوماتِ غیبی اور حقائق ابدی میں بھی، اپنی پیش کی ہوئی مذہبی و اخلاقی و معاشرتی اور مدنی تعلیمات میں بھی، اپنے اثرات و انقلابات میں بھی، اپنی پیشین گوئیوں اور اخبار میں بھی معجزہ ہے۔ مگر جب صرف الفاظ میں جو اس کے اعجازِ کامل کا صرف ایک پہلو اور گوشہ ہے، کوئی مقابلہ نہیں ہو سکا تو اس کے اعجازِ کامل میں کیا مماثلت ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم کا مطالعہ ایک مستقل موضوع ہر دور میں

رہا ہے اور علمی، ادبی اور دینی حیثیت سے اہلِ علم کو اس موضوع سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مضامینِ قرآنی میں ایسی اثر انگیزی ہے کہ اہلِ علم اس میں غور وخوض کے بغیر نہیں رہ سکے۔ مثلاً قرآنِ کریم کی امثال ہی کو لے لیجیے جو فصاحت و بلاغت کے اعلیٰ معیار کے مطابق ہیں، لہذا محققین نے ان کی دو تقسیمیں کی ہیں:

(۱) ایک تو وہ امثال جو کسی بات کو سمجھانے کے لیے تمثیل کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ فرمانِ ایزدی ہے:

﴿ مثل الذين ينفقون أموالهم في سبيل الله كمثل حبة أنبتت سبع سنابل ، في كل سنبلة مائة حبة ﴾۔ بتلانا یہ مقصود ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیے ہوئے مال کا بدلہ آخرت میں سات سو گنا بلکہ بعض حالات میں اس سے بھی زیادہ ملے گا۔ انسانی عقل اس کو ذرا بعید سمجھ سکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا دیا کہ جس طرح زمین میں ڈالا ہوا ایک بیج درخت پر سات سو نئے بیج لے کر نمودار ہوتا ہے، اسی طرح دنیا میں خرچ کیا ہوا مال آخرت میں سات سو گنا انسان کو ملے گا۔ اس قسم کی تمثیلات بات کو پوری طرح واضح کرنے اور مؤثر بنانے کے لیے لائی گئی ہیں۔

(۲) امثال کی دوسری قسم وہ ہے جسے اردو میں کہاوت کہتے ہیں۔ اس قسم کی امثال قرآن کریم میں دو طرح سے مذکور ہوئی ہیں۔ بعض تو وہ ہیں جو نزولِ قرآن کے بعد ہی کہاوت بنیں گویا ان کا موجد ہی قرآن ہے، مثلاً ﴿ هل جزاء الإحسان إلا الإحسان ﴾ اچھائی کا بدلہ اچھائی کے سوا اور کچھ نہیں۔ ﴿ و أن تعفوا أقرب للتقوى ﴾ معاف کر دینا تقوی کے زیادہ قریب ہے۔ کہاوتوں کی دوسری قسم وہ ہے جس میں صراحۃً کوئی کہاوت تو مذکور نہیں مگر آیت کے مفہوم سے نکلتی ہے، گویا یا تو عوامی ضرب الامثال کا سرچشمہ ہے یا ان کی طرف دلالت کرتی ہے۔ ایسی امثال کو امثالِ کامنہ کہا جاتا ہے اور اس کی قرآنِ کریم میں بے شمار مثالیں ہیں۔ مثلاً ایک عربی کہاوت مشہور ہے: "ليس الخبر كالمعاينة" "شنیدہ کے بود مانند دیدہ"، یہ قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں موجود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے عرض کیا کہ آپ مجھے دکھائیے کہ آپ مردے کو کس طرح زندہ کرتے ہیں۔ اس پر رب ذوالجلال نے پوچھا کہ تم اس پر ایمان نہیں رکھتے؟ اس وقت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے کہا: ﴿ بلى و لكن ليطمئن قلبي ﴾۔ اسی طرح مثل مشہور ہے "لا يلدغ المؤمن من جحر مرتين" کہ مردِ مومن ایک مرتبہ دھوکا کھانے کے بعد دوسری مرتبہ اسی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوتا۔ یہ مثل سورۂ یوسف جو احسن القصص ہے، میں بھی مذکور ہے جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ماں شریک بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ ہمارے ساتھ بنیامین کو بھی بھیج دیجیے تو انھوں نے جواباً فرمایا: ﴿ هل آمنكم عليه إلا كما أمنتكم على أخيه من قبل ﴾۔

قرآنی اسلوب ہدایت

قصص وحکایات کے تناظر میں

مولانا محمد خالد غازیپوری ندوی

قصہ گوئی ایک قدیم ادبی فن ہے جو دورِ اول سے لے کر عہدِ جدید تک جاری ہے۔ اور فنونِ ادبیہ میں قصہ گوئی مختلف مقاصد، اسلوبِ بیان کی عمدگی اور ذہنِ انسانی کو متاثر کرنے کی صلاحیت کے اعتبار سے منفرد وممتاز مقام کی حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں قصہ گوئی کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ملتی ہے جتنی کہ کسی دوسرے ادبی فن کی۔ قصے کا سب سے اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک طرف تو انسان کے اندر اپنی بات بہتر اور مؤثر انداز میں دوسروں تک پہنچانے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے، سوچ اور فکر میں ارتقا پیدا ہوتا ہے، تجسس کے فطری جذبے کی تسکین ہوتی ہے، معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، اور قصے کے ذریعے کی گئی بات دل میں زیادہ بیٹھتی اور راسخ ہوتی ہے، جلدی سمجھ میں آتی ہے۔

قرآن مجید کا معجزانہ اسلوبِ بیان انسان کے مروجہ کلام کی طرح نہیں ہے کہ محض اس کی ادبی چاشنی سے انسان کا شوق پورا کیا جائے یا اس کی تاثراتی کیفیت محض اثر پذیری کے لیے اختیار کی جائے۔ قرآنِ مجید کا اسلوبِ بیان اپنا الگ اندازِ حسن وتاثیر اور مقصدیت رکھتا ہے۔ وہ دراصل انسانی رخ کو صحیح کرنے اور اس کی اعلیٰ رہنمائی کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ اس میں یہ کیفیت رکھی گئی ہے کہ انسان وہ تاثر لے جو اس کی اصلاح کے مقصد کے لیے زیادہ سے زیادہ مؤثر ہو۔ لہٰذا اثر انگیز طریقۂ بیان جو مقصدِ کلام کے لیے مفید ہو اس میں ملتا ہے اور اس میں تنوع ہے۔ جہاں جیسا موقع ہو وہاں ویسا اسلوبِ بیان ملتا ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت جو اصنافِ بیان آتے ہیں ان میں حکایتی وقصصی اسلوب اپنی خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ انسان کے احساس وشعور میں طبعی انداز کا احساس وتاثر پیدا کردیتا ہے کہ کہنے والا کہتا جائے اور سننے والا ہمہ تن گوش ہوکر سنتا جائے۔

قصوں کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے دین کی دعوت اور تبلیغ کا کام زیادہ مؤثر اور راسخ انداز میں کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ بلکہ تقریباً ایک تہائی حصہ قصص اور واقعات پر مبنی ہے، اور اسی لیے قرآن نے انھیں عبرت، موعظت اور تذکیر قرار دیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب ﴾۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی

معرکہ آرا کتاب "الفوز الكبير في أصول التفسير" میں لکھا ہے کہ قرآنِ کریم میں جو معانی ومطالب بیان کیے گیے ہیں، وہ پانچ طرح کے ہیں: (۱) علمِ احکام (۲) علمِ مخاصمہ (۳) علمِ تذکیر بآلاء اللہ (۴) علمِ تذکیر بالموت (۵) علمِ تذکیر بایام اللہ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اور خلق کردہ واقعات وحالات کا علم، اس میں ان تمام واقعات کا بیان شامل ہے جو اطاعت شعار بندوں کے انعام اور نافرمان بندوں کی سزا اور عقوبت کے سلسلے میں پیش آئے ہیں۔

ان علومِ خمسہ میں سے جنھیں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے، ایک علمِ تذکیر بایام اللہ ہے، ''ایام'' یوم کی جمع ہے، اور ایام اللہ کے تحت ہر قسم کے تاریخی واقعات آجاتے ہیں۔ ایام کی اضافت اللہ کی جانب ان واقعات کی اہمیت پر دلالت کرنے کے لیے ہے۔ اس علم کو علم القصص کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: ﴿ فاقصص القصص لعلهم يتفكرون ﴾ (اعراف:۱۷۶)۔

قرآنِ کریم میں متعدد سابقہ قوموں اور امتوں کے واقعات بیان ہوئے ہیں اور اس ضمن میں بہت سے انبیاء کے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ و لقد أرسلنا رسلاً من قبلك منهم من قصصنا عليك ﴾ ''یقیناً ہم آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیج چکے ہیں جن میں بعض کے واقعات ہم آپ کو بیان کر چکے ہیں''۔

ان میں بعض انبیاء کے حالات وقصص تفصیل کے ساتھ بیان کیے گیے ہیں۔ بعض کے حالات یا صرف نام قرآن حکیم میں مذکور ہیں، اور جن پر تمام مفسرین کا اتفاق پایا جاتا ہے ان کی تعداد پچیس ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) حضرت آدم (۲) حضرت ادریس (۳) حضرت نوح (۴) حضرت ہود (۵) حضرت صالح (۶) حضرت ابراہیم (۷) حضرت لوط (۸) حضرت اسماعیل (۹) حضرت اسحاق (۱۰) حضرت یعقوب (۱۱) حضرت یوسف (۱۲) حضرت شعیب (۱۳) حضرت ایوب (۱۴) حضرت ذوالکفل (۱۵) حضرت موسیٰ (۱۶) حضرت ہارون (۱۷) حضرت داؤد (۱۸) حضرت سلیمان (۱۹) حضرت الیاس (۲۰) حضرت الیسع (۲۱) حضرت یونس (۲۲) حضرت زکریا (۲۳) حضرت یحیٰ (۲۴) حضرت عیسیٰ (۲۵) حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وعلیہم وسلم۔

قرآنی قصص کی اہمیت و افادیت بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

''ان قصص وحکایات کے بیان کا مقصد قصہ گوئی یا لوگوں کو اصل قصے سے آگاہ کرنا نہیں ہے، بلکہ ان قصوں کے ذکر کا اصل مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو اس امر کی طرف توجہ دلائی جائے کہ شرک اور نافرمانی کا کتنا دردناک انجام ہے، اور ان باتوں پر کس طرح عذابِ الٰہی نازل ہوتا ہے، اور انھیں اس کا اطمینان ہوجائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص اور اطاعت گزار بندوں کی ہمیشہ نصرت اور حمایت کرتا ہے''۔ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص:۴۷، کراچی، ۱۳۸۳ھ)۔

سید قطب شہیدؒ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''قرآنی قصے درحقیقت قافلۂ ایمان کے طویل اور

مسلسل سفر کی داستان اور روداد ہوتے ہیں، اور قرآن میں دعوتِ دین کی طویل کہانی کو سمو دیا گیا ہے جو نسلاً بعد نسل لوگوں کے سامنے پیش کی جاتی رہی اور لوگ اسے قبول کرتے رہے۔ یہ قصے ایک طرف تو انسانوں کی برگزیدہ ہستیوں کی کیفیتِ ایمان کو پیش کرتے ہیں، جنھیں اس کام کے لیے منتخب کیا گیا، اور دوسری طرف یہ بتاتے ہیں کہ ان برگزیدہ ہستیوں اور رب العالمین کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ ان قصوں کے ذریعے ہم دیکھتے ہیں کہ یوں یہ قافلۂ اہلِ کرم اس طویل شاہراہ پر چلا آتا ہے، دل کو روشنی، نور اور طہارت سے بھرتے ہوئے وہ دل کے اندر اس قیمتی متاع، متاعِ ایمان اور اس کائنات میں اس کی اہمیت کا شعور پیدا کرتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایمانی تصورِ حیات کو تمام دوسرے عارضی تصوراتِ زندگی سے ممیز کرتے ہوئے اسے انسان کے حس و شعور میں بٹھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ مجید جو کتابِ دعوت ہے، اس کا ایک بڑا حصہ ایسے ہی قصص پر مشتمل ہے''۔ (فی ظلال القرآن :۱/۶۵، بیروت، داراحیاء التراث العربی، ۱۹۸۱ء)۔

قرآن کے اس اسلوبِ بیان کا مطالعہ کیا جائے تو بے شمار نمونے جو اپنا الگ الگ متنوع انداز رکھتے ہیں، وہ دیکھنے کو ملیں گے۔ انسانوں کی ادبی کوششوں میں اس ادبی پہلو کو انسانوں کے خود فرض کردہ واقعات کو مؤثر ڈھنگ سے قارئین تک پہنچانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ انسانی ادب میں واقعات ایسے انداز سے پیش کیے جاتے ہیں کہ زندگی کے واقعات کے حساس پہلوؤں کا عکس سامنے آجاتا ہے۔ البتہ مقصدی لحاظ سے انسانی ادب کی اس صنفِ کلام میں زندگی کے واقعات کی صرف تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ اس میں اعلیٰ اور معیاری مقصد نہیں ہوتا، بلکہ واقعات کا صرف حساس پہلو پیش کر دیا جاتا ہے، لیکن قرآنِ مجید میں اس صنف کی شکل میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے، وہ بڑا بامقصد ہے۔ اور اس میں کئی طرح کے پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں ایک پہلو یہ ملتا ہے کہ واقعات کے بیان کرنے میں حسبِ موقع واقعات کی بعض کڑیاں چھوڑ دی جاتی ہیں، لیکن وہ اس طرح چھوڑی جاتی ہیں کہ اس کے چھوڑنے سے واقعہ بیانی پر اثر نہیں پڑتا اور واقعہ کے سمجھنے میں کوئی خلا بھی محسوس نہیں ہوتا، اور انسانی ذہن کو اس کے سلسلے میں کسی کمی یا دشواری کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ اور یہ اسی طرح ہوتا ہے کہ جیسے دو انسانوں کی بالمشافہ گفتگو میں بعض کڑیاں ایسی چھوڑ دی جاتی ہیں کہ ان کے چھوڑنے سے انسان کو مطلب کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''ایام اللہ یعنی وہ واقعات و حادثات جو فرماں برداری کے انعام اور نافرمان بندوں پر عذاب کے سلسلے میں اللہ کی جانب سے رونما ہوئے تھے، ان میں سے بھی قرآنِ مجید میں بیان کرنے کے لیے صرف انھیں واقعات کو منتخب کیا گیا ہے جن سے لوگ گوش آشنا اور جن کا ذکر اجمالی طور سے وہ پہلے بھی سن چکے تھے، مثلاً قومِ نوح، قومِ عاد اور قومِ ثمود کے واقعات جنھیں وہ اپنے باپ دادا سے سنتے آئے تھے، یا حضرت ابراہیم اور انبیائے بنی اسرائیل کے قصے جن سے اہل عرب یہودیوں

کے ساتھ صدیوں کی ہم سائگی کے سبب واقف تھے، چنانچہ قرآنِ مجید میں انھیں واقعات کا ذکر بار بار آیا ہے۔ ایسے واقعات جنھیں اہلِ عرب نے بہت کم سنا تھا یا ایران اور ہندوستان کے تاریخی قصص جن سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، ان کے ذکر سے پرہیز کیا گیا۔ جس طرح قرآنِ مجید میں کوئی نیا اور انوکھا واقعہ نہیں بیان کیا گیا، اسی طرح مکمل قصہ اور قصے کی تمام جزئیات بیان کرنے سے بھی پرہیز کیا گیا ہے، بلکہ قصوں کے صرف انھیں پہلوؤں کو منتخب کیا گیا ہے جن کا بیان کرنا حصولِ مقصد کے لیے ضروری تھا۔ ان واقعات کے بیان کرنے میں حکمت اور مصلحت یہ تھی کہ عوام جب کوئی نیا اور عجیب وغریب قصہ سنتے ہیں، یا ان کے سامنے قصے کی تمام تفصیلات پیش کی جاتی ہیں تو وہ قصے کی دلچسپیوں میں کھو جاتے ہیں، اور ان قصوں کے بیان کرنے کی اصل غرض فوت ہو جاتی ہے''۔ (الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، ص:۴۴-۴۵)۔

قصوں میں تکرار کا مقصد:

قرآن حکیم میں یہ اسلوب اختیار کیا گیا ہے کہ بعض واقعات کو بار بار اور متعدد مقامات پر دہرایا گیا ہے، اس کی افادیت بیان کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

''قرآنِ عزیز میں حق تعالیٰ نے انسان کی ہدایت کے لیے جو مختلف معجزانہ اسلوبِ بیان اختیار فرمائے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ گذشتہ قوموں کے واقعات وقصص کے ذریعے ان کے نیک وبد اعمال اور ان اعمال کے ثمرات ونتائج کو یاد دلائے، اور عبرت وبصیرت کا سامان مہیا کرے، اس لیے وہ تاریخی اسلوبِ بیان کے درپے نہیں ہوتا، بلکہ ابلاغِ حق اور دعوت الی اللہ کے اہم مقصد کے پیشِ نظر صرف انھیں وقائع کو سامنے لاتا ہے جو اس غرض وغایت کو پورا کرتے ہوں، اور اسی لیے قرآنِ عزیز میں ان کی تکرار پائی جاتی ہے، تاکہ سامعین کے دل میں وہ گھر کر سکیں، اور فکری اور طبعی رجحانات کو ان حقائق کی جانب متوجہ کیا جا سکے، اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ ایک بات کو مختلف پیرایۂ بیان اور مناسبِ حال اسلوبِ نگارش سے بار بار دہرایا جائے اور خوابیدہ قوائے فکر یہ کو پے در پے بیدار کیا جائے۔ قرآنِ مجید کے قصص وواقعات کا سلسلہ بیشتر گذشتہ اقوام اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے، اور جستہ جستہ بعض اور واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں، اور یہ تمام تر حق وباطل کے مجادلوں اور اولیاء اللہ واولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آمیز اور بصیرت خیز بے مثل ذخیرہ ہے''۔ (قصص القرآن، ص ۷-۸)۔

قصص کو مکرر ذکر کرنے کی حکمت بیان کرتے ہوئے ابن مسلم بن قتیبہ لکھتے ہیں:

''عرب کے وفود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تھے تو مسلمان ان کے سامنے قرآن حکیم کا کوئی قصہ پڑھ لیا کرتے تھے تو یہ ان کے لیے کافی ہوتا تھا، اور اسی طرح وہ مختلف قبائل کی طرف مختلف قرآنی سورتوں کو بھیجا کرتے تھے۔ اب اگر ان واقعات اور قصص میں تکرار نہ ہوتی تو (ایک سورت میں ایک واقعہ ذکر ہونے کی وجہ سے) واقعۂ موسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے پاس چلا جاتا، واقعۂ حضرت عیسیٰ

علیہ السلام کسی دوسری قوم کے پاس، قصۂ نوح علیہ السلام ایک اور قوم کی طرف اور قصۂ لوط علیہ لسلام کسی اور قوم کے پاس چلا جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور مہربانی کے ساتھ یہ چاہا کہ یہ قصص زمین کے تمام اطراف میں پھیل جائیں اور ہر ایک کان میں ان واقعات کو ڈالا جائے اور ہر دل میں انھیں ٹھہرایا جائے ، اور اس طرح حاضرین کی سمجھ بوجھ اور احتیاط کرنے میں ان واقعات کے اثر سے اضافہ ہو۔

واقعات میں تمثیل کا مقصد :

قرآنِ مجید میں بعض واقعات کو بطور تمثیل کے بیان کیا گیا ہے ، یعنی حقیقت میں یہ واقعات ماضی میں گذرے ہوئے نہیں ہیں، بلکہ یہ واقعات ایک مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، اور یہ حقیقت کسی بھی زبان کے فصیح و بلیغ ادیب سے مخفی نہیں، اور وہ جانتا ہے کہ مثال کا یہ طریقہ موعظت ونصیحت کے لیے کس درجہ مفید اور دلنشیں ہوتا ہے۔ جیسے سورۂ کہف میں کافر و مومن یا اصحاب الجنہ کا واقعہ کہ قرآن کا مقصد ان کے بیان کرنے سے صرف حسبِ حال ایک مثال دینا ہے، خواہ وہ ماضی میں گذرا ہوا واقعہ ہو یا نہ ہو۔ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ دہلوی لکھتے ہیں:

'' قرآنِ مجید میں اسی انداز کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جن سے بیک وقت دو مختلف صورتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت سعید اور نیک بخت کی ہوتی ہے اور دوسری صورت شقی اور بد بخت کی۔ سعید کی صورت کے ساتھ ہی کچھ اوصافِ سعادت بیان کیے جاتے ہیں اور شقی و بد بخت کے ساتھ کچھ اوصاف بدبختی کے بیان کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں کسی معین فرد یا خاص شخص کی طرف اشارہ مقصود نہیں ہوتا ، بلکہ اس طرح کے اعمال اور اوصاف کے بارے میں احکام بیان کرنا مقصود ہوتا ہے''۔

(الفوز الکبیر ص ۷۱-۷۲)۔

اعجاز کا اثبات :

قصصِ قرآنی کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے قرآنِ مجید کا اعجاز ثابت ہوتا ہے۔ علامہ بدر الدین زرکشیؒ فرماتے ہیں:

'' وجوہِ اعجازِ قرآن کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ اس میں پچھلی امتوں کے صحیح واقعات بیان ہوئے ہیں۔ گزشتہ اقوام کے مذہبی عقائد ومسائل اور ان کے قصوں کا صحیح وسچا تذکرہ جس کی روشنی میں کتبِ سماویہ کے گم شدہ حقائق دستیاب ہو جائیں، یقیناً اعجاز اور ساری کائنات کے لیے چیلنج ہے، کیونکہ ذرائعِ علم بظاہر تین ہیں: مشاہدہ، مطالعہ اور مغیبات۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ان میں سے کوئی ایک ذریعہ بھی موجود نہیں تھا۔ پہلے کی نفی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ﴿ و ما كنت بجانب الغربي إذ قضينا إلى موسى الأمر ، و ما كنت من الشاهدين ﴾ (سورہ قصص:۴۴) اور تو نہ تھا (کوہِ طور کے) غرب کی طرف جب ہم نے بھیجا موسیٰ کو حکم اور نہ تھا تو دیکھنے والا)۔

دوسرے ذریعے کی بھی نفی فرمائی: ﴿ و ما كنت تتلو من قبله من كتاب و لا تخطه بيمينك ، إذًا

لارتاب المبطلون ﴾ (عنکبوت:۴۸)۔اس سے پہلے تو آپ کوئی کتاب پڑھتے نہ تھے اور نہ کسی کتاب کو اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے تھے کہ یہ باطل لوگ شک وشبہ میں پڑتے)۔

اور تیسرے ذریعۂ علم کی نفی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿ تلک من أنباء الغیب ، نوحیها إلیک ، ما کنت تعلمها أنت و لا قومک من قبل هذا ﴾ (ہود: ۴۹)۔ یہ خبریں غیب کی خبروں میں سے ہیں، جن کی وحی ہم آپ کی طرف کرتے ہیں، انھیں اس سے پہلے آپ جانتے تھے نہ آپ کی قوم)۔

مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی لکھتے ہیں:

''کیا یہ قرآن عزیز کے کلام الٰہی ہونے کی ایک ناقابلِ تردید شہادت نہیں ہے کہ ایک امی انسان، ایک ایسے ملک میں جہاں ہر قسم کے علمی ذرائع مفقود ومعدوم ہیں، دنیا کی قوموں کو رشد وہدایت کے سلسلے میں اقوام اور امم سابقہ کے ایسے تاریخی واقعات سناتا ہے جن کے ایک حرف کی بھی تردید نہیں ہوسکی، اور صدیوں تک علماءِ تحقیق نے کروڑوں اور اربوں روپیہ اور اپنے قیمتی وقت اور عمر کو صرف کرکے جب ان حالات کو جدید علومِ انکشاف کے ذریعے مشاہدہ کی حد تک حاصل کیا تو ان کو بالآخر یہ اقرار کرنا پڑا کہ قرآن نے ان سے متعلق جو کچھ کہا اور جس قدر کہا، بلاشبہ علم وتحقیق اس کے آگے ایک شوشہ بھی اضافہ نہیں کرسکا، چہ جائیکہ اس کے خلاف ثابت کرسکتا''۔

(قصص القرآن:۳/۸۴-۸۵)۔

سید قطب شہیدؒ قرآنِ کریم کے ادبی محاسن پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''لہٰذا قرآنِ کریم کو جب بھی وجدان وضمیر میں اثر انگیزی کے زاویۂ نگاہ سے پڑھا جائے تو انسانی اور زندہ مناظر اس میں بکثرت ملتے ہیں۔قرآن کا قاری جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے سامنے علم وعرفان کے نئے نئے دریچے وا ہوتے چلے جاتے ہیں۔الفاظ ومعانی کا تطابق وتوافق، نظم و ترتیب کا حسن وجمال، شیریں بیانی اور جادو نگاری، مضامین کا ربط واتصال، تعبیر وبیان کی لطافت وبرجستگی، واقعات کی منظر کشی، خوش آئند موسیقی، اجزاء کی باہمی یگانگت، اسلوب وانداز کا تنوع وتفنن، غرض وہ کون سی خوبی ہے جو قرآن مجید میں موجود نہیں۔حسن وجمال کا کون سا پہلو ہے جس سے قرآن بہرہ ور نہیں۔اور انھیں تمام اوصاف ومحاسن کے یکجا ہوجانے سے قرآنی اعجاز کی تکمیل ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ تذکیر بایام اللہ کے سلسلے میں قرآنِ مجید میں بیان شدہ قصص وواقعات جن کا بیشتر حصہ اقوامِ ماضیہ اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے، اور جس کے ضمن میں بعض اور واقعات بھی بیان ہوئے ہیں، ان کے بے شمار فوائد اور مقاصد ہیں اور یہ قصص تمام تر حق وباطل کے مجادلوں، اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز بے مثال ذخیرہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

قرآن مجید کا ناصحانہ اسلوب

(چند تمثیلات کی روشنی میں)

ڈاکٹر عبدالرشید ندوی مدنی

قرآنِ کریم سرچشمہ حیات ہے۔ وہ عقائد و شریعت کا منبع و ماخذ ہے۔ قرنِ اول سے لے کر آج تک اسلامی تہذیب و ثقافت نے جب بھی ارتقا کی منزلیں طے کی ہیں تو اس نے ہر دور میں کائنات اور طرزِ حیات میں حسن پیدا کرنے کے لیے اس کو معیارِ حقیقی قرار دیا ہے۔ وہ انسان کے مادی و روحانی ارتقا کی ہر منزل کو ایک ایسے سانچے میں ڈھالتا ہے جو سراسر خیر ہے اور تمدن و تہذیب کے باطنی و ظاہری، ذہنی و علمی شر سے مبرا و پاک کرتا ہے۔ اپنی تعلیم کی ہمہ گیریت اور زبان و بیان کے لحاظ سے یکتا ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر زمانے، ہر ماحول اور ہر مرحلے میں خیر و فلاح کے منبع کے ساتھ ساتھ روشنی کا مینارہ رہا ہے اور رہے گا۔

قرآنِ کریم ایک بے مثال کتاب ہے۔ وہ اپنی لفظی ترکیب کے لحاظ سے نظم و نثر دونوں سے مختلف بھی ہے اور دونوں کی خوبیاں بھی لیے ہوئے ہے۔ طریقۃ بین طریقتین ،اس میں قافیہ بندی بھی ہے اور نہیں بھی۔ اس کے قافیے تکلف اور خیال آرائی سے بالکل پاک اور بحر کی قید سے آزاد ہیں۔ اس کے باوجود اس کی آیتوں میں عجیب موزونیت پائی جاتی ہے۔ اس میں علمِ بیان کی خصوصیات بھی ہیں اور واضح کلام کی خوبیاں بھی۔ وہ ایسی نثر نہیں جس میں الفاظ کی نشست کا التزام نہ ہو۔ وہ جس طرح اپنی دوسری خصوصیات میں منفرد ہے، اسی طرح وہ اپنے اندازِ بیان میں بھی منفرد ہے۔ وہ نہ فلسفے کی کتاب ہے اور نہ ہی قصہ کہانیوں کی۔ لیکن اس میں فلسفہ بھی ہے اور حقیقی قصے بھی۔ اس نے اقوامِ غابرہ اور انبیاء صالحین کے جو احوال پیش کیے وہ صرف اس لیے ہیں کہ آفاقی پیغام کی ترسیل ہو۔ وہ ان احوال سے ایک منظم اور مکمل تصورِ حیات قائم کرنا چاہتا ہے جس سے کائنات اور انسانی زندگی میں ایک معین نظریہ اور انسانی معاشرت کے ساتھ تہذیب و تمدن کے اصول و اقدار میں ایک واضح نظام متعین ہو جائے۔ وہ ان احوال و امثال سے انسانوں کو حقیقت کی کلید عطا کرتا ہے تاکہ ان میں حسنِ عمل کی تحریک بیدار ہو، شعور تربیت پا سکے اور کردار کی تعمیر بھی ہوتی رہے۔

قرآنِ کریم نے اپنے مضامین کے طریقِ ادا میں کبھی دعوت ونصیحت کے اسلوب کو اپنایا ہے تو کبھی ترغیب و تسلی سے کام لیا ہے۔ کہیں زجر وملامت ووعید وعذاب کے بیان کو ضروری سمجھا ہے تو کہیں بشارت وثواب اور نعمت و رحمت کا انداز اختیار کیا ہے۔ کہیں خطاب براہِ راست ہے تو کہیں دیکھتے ہی دیکھتے مخاطب غائب بن جاتا ہے اور غائب مخاطب، متکلم یکا یک غائب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور غائب متکلم کے لباس میں نمودار ہوتا ہے۔ اگر کسی تمثیل کو عقائد کے بیان میں پیش کیا ہے تو فلسفہ وکلام کے انداز میں نہیں۔ اگر تشبیہ سے اخلاق کی تعلیم مقصود ہے تو علم الاخلاق کے اسلوب میں نہیں۔ اگر استعارہ کا استعمال تمدن و سیاست اور حقیقت و معاشرت بیان کرنے کے لیے ہے تو علوم وعمران کے ڈھنگ پر نہیں۔ اگر اس سے مقصود ضابطہ و اصول بیان کرنا ہے تو منصفوں کے طریقے سے بالکل مختلف۔ اور اگر اس کی غرض تاریخی حقائق کو ذکر کرنا ہے تو تاریخ نگاری کے نہج سے یکسر جدا۔ حالانکہ اس کے مخاطبین مختلف ذہنیتیں اور مختلف استعدادیں رکھنے والے ہیں، بھلے وہ شہری ہوں یا دیہاتی، تعلیم یافتہ ہوں یا ان پڑھ، سلیم الفطرت ہوں یا کج طبع، وحی ورسالت کے ماننے والے ہوں یا اس کے منکر، توحید شناس ہوں یا اہلِ شرک، وہ ہر ایک کو تمثیلات کے ذریعے شاہراہِ حق کی دعوت دیتا اور تدبر وتفقہ پر بھی ابھارتا ہے۔ ﴿ أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها ﴾۔ اس کا طرزِ بیان اتنا سہل اور آسان ہے کہ اس کے مسلسل مطالعہ سے دل ودماغ پر نئے نئے معانی کھلتے، اس کے ورد سے دل کی کیفیات میں تغیر پیدا ہوتا اور فکر وذہن کو جلا ملتی ہے۔ ﴿ ألا بذكر الله تطمئن القلوب ﴾، اس کے وضاحتی اسلوب، قوتِ تاثیر، جمال و رعنائی اور قوتِ تصویر سے عقل وجذبہ دونوں کو غذا فراہم ہوتی اور دل ودماغ میں نور کی کرنیں ابھرنے لگتی ہیں۔ قرآن کا اسلوب، اس کا جمال اور اس کی قوت وبلاغت قرآن ہی میں پنہاں ہے۔ بہت سے غیر عربی داں حضرات اس کی فصاحت وبلاغت کی چاشنی کا مزہ تراجمِ قرآن سے لینے کی کوشش کرتے ہیں، کسی بھی زبان کا ترجمۂ قرآن قرآن کریم کے اسلوبِ بیان، فصاحت وبلاغت، نظم ونسق، روانی وترتیب، نزاکت و بیان، صوتی آہنگ ومعانی کی بلندی اور اس کی اثر انگیزی کا بدل تو دور کی بات، اس کے عکس کا ایک فیصدی حصہ بھی شاید ابھر کر نہ آئے۔

قرآنِ کریم اخلاقی اقدار کو پیش کرنے کے لیے حکایات، تمثیل، تشبیہ واستعارہ، تعریف وتحسین، زجر وتوبیخ اور وعدہ ووعید کا طریقۂ کار اپناتا ہے، کیونکہ یہ طریقۂ ادا نفس انسانی پر ایک تاثر چھوڑتا اور ذہن وفکر میں ایک اضطراب بپا کرتا ہے، وہ انسان کے اخلاقی کرداروں کو تمثیل کا روپ دے کر یا تو ان کی اہمیت کو واشگاف کرتا ہے یا پھر ان کا قابل نفرت ہونا گردانتا ہے۔ انسانی عادات واطوار کو مرئی شکل

دے کر متعدد جگہ پیش کیا گیا، چنانچہ ہوائے نفس کے پیروکار اور تجلیاتِ ربانی سے روگردانی کرنے والوں کے کیرکٹر کی تصویر ﴿ فمثله كمثل الكلب ، إن تحمل عليه يلهث أو تتركه يلهث ﴾ کی شکل میں پیش کر کے ہوائے نفس کے پرستار کو اپنی اخلاقی ذہنیت کے اعتبار سے ایک ایسے کتے سے تشبیہ دیتا ہے جس کا نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ، نہ اس میں غیرت ہے نہ حمیت، دھتکاریے تو بھی زبان لٹکائے ہے اور نگاہ ہٹا لیجیے تو بھی زبان دنداں و جبڑوں کی سرحدوں سے بہت دور لٹکی دکھائی دیتی ہے۔ اس تمثیل میں زبان کو نمایاں کرنے میں ذہن خود بخود اس معنی کی جانب منتقل ہوتا ہے کہ یہ کردار صرف پیٹ کے بندے کا ہے۔ ایک دوسری تمثیل سورۃ المدثر میں ہے: ﴿ فما لهم عن التذكرة معرضين ، كأنهم حمر مستنفرة ، فرت من قسورة ﴾ اس تمثیل میں ان مشرکینِ عرب کا کردار ہے جو خود بھی دعوتِ حق سے دور ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے بھگاتے ہیں، اس استعارے میں نقشہ ان چند گدھوں کا ہے جو جنگل میں چرتے چرتے اچانک ایک خوفناک آواز سن کر بدک کر اندھا دھند بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور انداز ایسا اپناتے ہیں کہ ہر ملنے والے کو خوف و اضطراب میں مبتلا کر کے ساتھ لیے بھاگتے ہیں۔ تمثیل میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ شیر کی آمد پر گدھے کا اندھا دھند بھاگ کھڑا ہونا ذریعۂ نجات نہیں کیونکہ بالآخر وہ ان کو دبوچنے ہی والا ہے۔

قرآنِ کریم کا یہ اندازِ بیان نفسِ انسانی کا تجزیہ کر کے نفس کا چور پکڑتا ہے، اور وہ مختلف اخلاقی قدروں کو کردار کے پیرائے میں لا کر ان کا تقابل کرتا ہے۔ پھر وہ ماضی کے واقعات کو حال پر چسپاں کرتا اور مستقبل کو حال بلکہ ماضی بنا کر دکھاتا ہے۔ یہ طرزِ بیان نہ تو فلسفیانہ ہے نہ ناواعظانہ، بلکہ اعلیٰ درجے کا ادبی طرزِ بیان ہے۔ تمثیل کی غرض یہ ہے کہ کسی غیر واضح اور غیر محسوس حقیقت کو مخاطب کے فہم سے قریب تر لانے کے لیے کسی ایسی چیز سے تشبیہ دی جائے جو واضح اور محسوس ہو یا جو چیز عام نگاہوں سے اوجھل ہے۔ تمثیل کے ذریعے گویا اس کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا یہ طرزِ بیان بڑی کثرت کے ساتھ آیا ہے، کیونکہ جن حقائق سے وہ آگاہ کرنا چاہتا ہے، وہ تقریباً سب کے سب غیر مرئی و غیر محسوس ہیں۔

ملاحظہ ہو منافقین کے حالات کی تمثیل: ﴿ مثلهم كمثل الذي استوقد نارًا ، فلما أضاءت ما حوله ذهب الله بنورهم و تركهم في ظلمات لا يبصرون ، صم بكم عمي فهم لا يرجعون ، أو كصيب من السماء فيه ظلمات و رعد و برق ، يجعلون أصابعهم في آذانهم من الصواعق حذر الموت ، و الله محيط بالكافرين ، يكاد البرق يخطف أبصارهم كلما أضاء لهم مشوا فيه ، و إذا أظلم عليهم قاموا ، و لو شاء الله لذهب بسمعهم و أبصارهم ، إن الله

علی کل شئ قدیر ﴾ ،ان آیات میں دومثالیں ہیں۔ایک ناری ہےاوردوسری مائی۔اگرغورکیا جائے تو آگ وپانی روشنی وزندگی کا سرچشمہ ہیں۔آیت میں منافقین نے تو وحیِ الٰہی کو اپنے لیے دلیلِ راہ بنایالیکن اپنی ہی بدبختیوں کی بدولت اس پر قائم نہ رہ سکے،یعنی دائرۂ اسلام میں قدم تو رکھا،اس کی روشنی میں چلنا چاہا،فوائد حاصل کیےاورمسلمانوں میں گھل مل گیے لیکن یہ ملاپ ایمانی جذبے کے تحت نہ تھا،اس لیے اللہ نے اسلام کی یہ روشنی ان کے دلوں سے بجھادی اور ان پر ظلم و تاریکی کا پردہ ڈال دیا۔قرآن کی آبی تمثیل کے آئینے میں منافقین کی تصویر پرغورفرمائیے،وہ کہتا ہے،ان کی مثال ان لوگوں کی سی ہے جو چلتے چلتے زورشور کی بارش میں گھر گیے ہوں، بادلوں کی ہمہ گیر تاریکی ان پر مسلط ہے ، ہولناک بجلیوں کی کڑک چمک ہےتو اس کی مدد سے دوقدم آگے چل لیتے ہیں لیکن جب زور کی بجلی کڑکتی ہےاورکوندتی ہےتوڈر کے مارے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں اور آنکھیں بند کرلیتے ہیں کہ کہیں صاعقۂ آسمانی آنہ لےاورتارِحیات ٹوٹ نہ جائے۔

قبولِ حق کی استعدادواورعدمِ استعداد کی تمثیل یوں بیان کرتا ہے:﴿ مثل الفریقین کالأعمی و الأصم و البصیر و السمیع ، ھل یستویان مثلاً ، أفلا تذکرون ﴾ ، پہلے گروہ کواندھے بہرے سے تعبیر کرتا ہے اوردوسرے کو بیدارمغزقراردے کراس استفہامِ انکاری سے جوزور پیدا کرتا ہے وہ صرف انکار کے اسلوب میں کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔مشرکین واولیاءِ مشرکین کی بےبسی کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ کمزورگھروناتواں کیڑے کی مثال پیش کرتا ہے:﴿ مثل الذین اتخذوا من دون اللہ أولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتًا ، و إن أوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون ﴾ ،یہ بےبس اور بےیارومددگار اپنی محرومی وکمزوری کے اس نقطۂ کمال کو پہونچ چکے ہیں کہ اب ان کے ہاتھ سوائے ضعف و نقصان کےاورکچھ نہیں۔

کافروں کے اعمال کا حشر دیکھیے ،کس طرح تمثیلی پیرایہ اختیارکرتا ہے:﴿ الذین کفروا أعمالھم کسراب بقیعة یحسبه الظمآن ماء ، حتی إذا جاءه لم یجده شیئًا ، و وجد اللہ عنده ، فوفاه حسابه ، و اللہ سریع الحساب ، أو کظلمات في بحر لجي یغشاه موج من فوقه موج من فوقه سحاب ، ظلمات بعضھا فوق بعض ، إذا أخرج یده لم یکد یراھا ، و من لم یجعل اللہ له نورًا فما له من نور ﴾ ،کہ ان کے عقائداور ان کے اعمال کی یہ عمارت جو بے بنیادستونوں پر کھڑی ہے، ایسی ہی ہے جیسے چٹیل میدان کی چمکتی ریت جودور سے نگاہوں میں پانی کا وجود پیش کرتی ہے۔غورفرمائیے کہ سراب کے ساتھ بقیعة کی قید نے حیوانی ونباتی وجود کے نام ونشان تک کومٹادیا ۔خودسراب بےحقیقت وبےاصل ہے،اس پر بقیعة کی قید

نے ہر غیر جمادی وجود سے خالی کر دیا کہ بالکل اسی طرح ان کے دلوں میں آفتاب ہدایت کی کرنوں کا گذر نہیں، اور جس طرح پیاسا آدمی چمکتی ہوئی ریت کی طرف پانی سمجھ کر لپکتا ہے اور حسرت و یاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا، اسی طرح میدانِ حشر میں ان کے اعمال کا نام ونشان تک نہ ہوگا۔

اسی طرح قرآن نے کفر کے لاعلاج مریضوں کی حالت کی مثال ﴿ إن هم إلا كالأنعام بل هم أضل سبيلاً ﴾ سے دی۔ اور غیبت کرنے والوں کے فعلِ شنیع کو ﴿ أيحب أحدكم أن يأكل لحم أخيه ميتا فكرهتموه ﴾ سے بیان کیا۔ اور کتاب الٰہی پر عمل نہ کرنے والوں کی تمثیل ﴿ مثل الذين حملوا التوراة ثم لم يحملوها كمثل الحمار يحمل أسفارًا ﴾ سے دی کہ عمل واتباع کے بغیر کتاب کے الفاظ دہرانے والے ایسے ہیں جیسے گدھا جس کی پشت پر کتابوں کا انبار لدا ہوتا ہے، اسے مطلق علم نہیں کہ اس میں کیا ہے۔ اور مشرکین کی حسرت ناک ہلاکت کی تمثیل کو کس قدر ہولناک انداز میں بیان کرتا ہے: ﴿ و من يشرك بالله فكأنما خرّ من السماء فتخطفه الطير أو تهوي به الريح في مكان سحيق ﴾۔ کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کی مثال یوں پیش کرتا ہے: ﴿ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت و فرعها في السماء ، توتي أكلها كل حين بإذن ربها ، و يضرب الله الأمثال للناس لعلهم يتذكرون ، و مثل كلمة خبيثة كشجرة خبيثة اجتثت من فوق الأرض ما لها من قرار ﴾۔

الغرض تشبیہات وتمثیلات، تذکیر و وعظ، ترغیب و تحریض، زجر وعبرت، مراد کو فہم سے قریب لانے اور عقلی باتوں کو محسوس کا روپ دے کر سمجھانے کا اس سے بہتر طریقہ اور نہیں ہوسکتا جس کو قرآن نے تمثیلات کے ذریعے واضح کر دیا ہے۔ ﴿ فاعتبروا يا أولي الأبصار ﴾۔

☆☆☆

اسلوبِ قرآنی وارشادِ رحمانی

اقبال احمد ندوی
دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

اللہ رب العزت نے یہ دنیا آباد کی اور اسے زیب و زینت و رونق بخشی تو اسی کے ساتھ ہی دنیا میں آباد جن و بشر کی ہدایت و رہنمائی کا سامان بھی کیا۔ حضرتِ آدم علیہ الصلاۃ و السلام کو دنیا میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا۔ اُسی وقت سے نبیوں اور رسولوں کی آمد کا سلسلہ بھی جاری فرمایا۔ اُنھیں حسبِ ضرورت معجزے بھی عطا کیے اور ان پر آسمانی صحیفے اور کتابیں بھی نازل فرمائیں۔ نبیوں کی بعثت کا سلسلہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوکر ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوتا ہے۔ آپ کی نبوت و رسالت تا قیامِ قیامت باقی و قائم رہنے والی ہے۔ آپ کی رسالت دائمی بھی ہے اور عالمی بھی۔ اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب ''قرآنِ مجید'' آپ کا زندہ جاوید معجزہ اور اللہ تعالیٰ کی آخری آسمانی عالم گیر کتاب ہے۔ اس میں ہر عہد، ہر نسل اور ہر طرح کے حالات کے لیے ہدایت و رہنمائی موجود ہے۔ اس کی معجز نمائی بحیثیتِ مجموعی بھی ہے اور جزوی حیثیت سے بھی۔ یعنی قرآنِ مجید مکمل شکل میں تو ایک معجزہ ہے ہی، جس پر سارے مسلمانوں کا ایمان ہے۔ اسی طرح اس کی ہر آیت بلکہ اس کا ہر ہر لفظ بھی مستقل ایک معجزہ ہے۔ اور اس کا اعجاز مختلف زبانوں، مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں اس طرح ظاہر ہوتا رہا ہے کہ اس کے لیے آفتاب کی مثال دینا بھی بے ادبی ہے۔ آپ قرآنِ مجید کو ایک مرتبہ نہیں، سو مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ اور لاکھ مرتبہ پڑھیے تب بھی آپ کو اس میں حلاوت، طراوت، تازگی اور لذت و جدت محسوس ہوگی اور معلوم ہوگا کہ قرآنِ مجید آج ہی نازل ہوا ہے۔ قرآنِ مجید ایک بحرِ زخار ہے۔ ایک عمیق اور گہرا سمندر ہے۔ جس میں آبدار اور بیش بہا موتی اور خزانے مخفی ہیں۔ اس میں جو جتنا غوطہ لگائے گا، اتنا ہی اپنا دامن موتیوں سے بھر یگا۔

یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہی ہے کہ کفارِ عرب و مشرکینِ مکہ نیز دشمنانِ اسلام نزولِ قرآن کے وقت سے لے کر اب تک باوجود بار بار کی تحدی کے اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے پیغمبرِ اسلام حضورِ اکرم (ﷺ) اور صحابۂ کرام (رضی اللہ عنہم) سے متعدد جنگیں لڑیں، اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کرایا، اپنی عزت و ناموس کو خاک میں ملایا، یہ سب کیا لیکن جو کرنے کا کام تھا، وہ نہ کیا یعنی قرآن کی کوئی مثال نہ پیش کر سکے اور کوشش کی بھی تو ناکام رہے اور منہ

کی کمائی۔ جب کہ وہ زبان کے دھنی اور بیان کے غنی تھے۔خود کو اہلِ زبان (عرب) اور اپنے علاوہ ساری دنیا کو بے زبان (عجم) کہتے نہیں تھکتے تھے۔پھر بھی وہ کچھ نہ کر سکے اور دین دنیا دونوں میں نقصان اٹھایا۔

اعجازِ قرآنی کے اسیر اور اس کی جادو بیانی کے قتیل اپنے تو اپنے غیر بھی تھے۔قرآن کا جادو سب پر چڑھ کے بولتا تھا۔اس سلسلے میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ ان کے اسلام قبول کرنے سے پہلے کا بہت مشہور ہے بلکہ قرآن کا سننا ہی ان کے اسلام لانے کا سبب بنا۔ چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رکن حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان نماز پڑھتا ہوا دیکھ کر قریب سے جاکر قرآن سنا تو اتنا متاثر ہوئے کہ خود فرماتے ہیں کہ " **فلما سمعت القرآن رقّ له قلبي فبكيت، و دخلني الإسلام** " یعنی جب میں نے قرآن سنا تو میرا دل پسیج گیا اور میں شدتِ تاثر سے رو پڑا اور اسلام میرے اندر جاگزیں ہوگیا۔ایک دوسری مشہور روایت میں ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب اپنی حقیقی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے اسلام لانے کی خبر سنکر ان کے گھر گیے اور انھیں مار کر لہولہان کر دیا تو اپنی بہن کا خون بہتا ہوا دیکھ کر نادم ہوئے اور قرآن سنانے کی فرمائش کی اور جب حضرت فاطمہ کے شوہر حضرت سعید نے انھیں سورہ طہٰ پڑھنے کو دی تو شروع کرتے ہی بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا: " **ما أحسن هذا الكلام و أكرمه** " کہ واہ کیا ہی عمدہ اور پاکیزہ کلام ہے۔

اسی طرح ولید بن مغیرہ قرآن سنکر متاثر ہوا تو قریش نے اسے بددین ہونے کا طعنہ دیا اور ابوجہل کو اس کے پاس سمجھانے کے لیے بھیجا تا کہ وہ اسلام قبول نہ کر سکے تو اس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا: " **إن لقوله حلاوة، و إن عليه لطلاوة ، و إنه ليحطم ما تحته ، و إنه ليعلو و ما يعلى** " کہ اس میں شیرینی و حلاوت ہے، اس میں تروتازگی و طراوت ہے، یہ کلام اپنے سامنے آنے والے سارے حریفوں کا قلع قمع کر دیتا ہے، انتہائی بلند وارفع کلام ہے، کوئی کلام اس سے بڑھ کر نہیں ہے۔اس پر بھی ابوجہل نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا اور چاہا کہ ولید قرآن کے بارے میں کوئی منفی تبصرہ کرے تو اس وقت اس نے کہا تو یہ کہا: " **إن هذا إلا سحر يؤثر ، أما رأيتموه يفرق بين الرجل و أهله و مواليه** " کہ میں تو یہی کہوں گا کہ یہ کلام جادو ہے اور جادو بھی وہ جو سر چڑھ کے بولتا ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ یہ انسان کو اس کے اہل وعیال، گھر والوں اور متعلقین سے جدا کر دیتا ہے۔قرآن کریم کی سورہ مدثر کی یہ آیات اسی واقعے کے سلسلے میں نازل ہوئی ہیں: ﴿ **إنه فكر و قدر ، فقتل كيف قدر ، ثم قتل ، كيف قدر ، ثم نظر ، ثم عبس و بسر ، ثم أدبر و استكبر ، فقال : إن هذا إلا سحر يؤثر** ﴾ ۔ (سورہ مدثر:۱۸-۲۴)(التصوير الفني في القرآن ، سيد قطب ، ص ١٢-١٤ ملخصاً) ۔

دشمن اسلام عتبہ نمائندۂ کفار بن کر خدمت نبوی میں حاضر ہوتا ہے اور طویل گفتگو کرتا ہے، آپ (ﷺ) فرماتے ہیں: ابوالولید! کیا تم اپنی بات کہہ چکے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں، تب آپ (ﷺ) نے قرآن کریم کی آیات ﴿حم ، تنزیل من الرحمن الرحیم﴾ اور ﴿فإن أعرضوا فقل أنذرتكم صاعقة مثل صاعقة عاد و ثمود﴾ (سورہ فصلت: ۲۴) سنائیں۔سن کر اپنے ساتھیوں کے پاس جا کر کہتا ہے: (و الله لقد سمعت من محمد كلاماً ما هو من كلام الإنس، و لا من كلام الجن ، و إن له لحلاوة ، و إن عليه لطلاوة، إن أعلاه لمثمر ، و إن أسفله لمغدق) ۔بخدا میں نے (حضرت) محمد (ﷺ) سے ایک ایسا کلام سنا جو نہ کلام انسانی ہے اور نہ کلام جنی، اس کلام میں بڑی مٹھاس ہے، یہ کلام بڑا ہی بارونق و پُرنور ہے۔اسے اوپر سے دیکھیں تو پھلوں سے لدا ہوا اور نیچے سے دیکھیں تو بڑا ہی پُر بہار ہے۔

عرب سرداروں نے قرآن اور اسلام کے مٹانے اور پیغمبر اسلام (ﷺ) کو مغلوب کرنے میں جس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگایا، وہ کسی لکھے پڑھے آدمی سے مخفی نہیں۔لیکن عربوں نے اپنی خاص مجلسوں میں قرآن کے بے مثل ہونے کا اعتراف کیا اور جو ان میں منصف مزاج تھے، انھوں نے اس اعتراف کا اظہار بھی کیا۔قریشی سردار نضر بن حارث نے ایک مرتبہ اپنی قوم کو خطاب کر کے کہا:

”اے قومِ قریش ! آج تم ایک مصیبت میں گرفتار ہو کہ اس سے پہلے کبھی ایسی مصیبت سے سابقہ نہیں پڑا تھا کہ محمد (ﷺ) تمھاری قوم کے ایک نوجوان تھے، اور تم سب ان کے عادات و اخلاق کے گرویدہ اور اپنی قوم میں ان کو سب سے زیادہ سچا اور سب سے زیادہ امانت دار جانتے اور کہتے تھے، اب جب کہ ان کے سر میں سفید بال آنے لگے تو تم انھیں جادوگر بتانے لگے، خدا کی قسم وہ جادوگر نہیں، ہم نے جادوگروں کو دیکھا اور برتا ہے، ان کے کلام سنے ہیں اور طریقوں کو سمجھا ہے، وہ بالکل اس سے مختلف ہیں۔اور کبھی تم ان کو کاہن کہنے لگے، خدا کی قسم وہ کاہن بھی نہیں ہیں، ہم نے بہت سے کاہنوں کو دیکھا اور ان کا کلام سنا ہے، ان کو ان سے کوئی مناسبت نہیں، ہم خود بحر شعر کے شناور ہیں اور بڑے بڑے شعرا کے کلام ہمیں زبانی یاد ہیں، ان کے کلام سے اس کو کوئی مناسبت نہیں۔ پھر کبھی تم ان کو مجنون بتاتے ہو، خدا کی قسم وہ مجنون بھی نہیں، ہم نے بہت سے مجنونوں کو دیکھا بھالا ہے اور ان کی بکواس سنی ہے، ان کے مختلف کلام سنے ہیں، یہاں یہ کچھ نہیں، اے میری قوم! تم انصاف کے ساتھ ان کے معاملے میں غور

کرو، یہ سرسری ٹلا دینے کی چیز نہیں''۔ (مفتی محفوظ الرحمٰن عثمانی۔ کاروان ادب جلد ۱۵، شمارہ ۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۸ ص ۱۵-۱۶)

انسان تو انسان، جنات بھی قرآن کی معجز نمائی اور اثر انگیزی دیکھ کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ: ﴿ انا سمعنا قرآناً عجبا ﴾ (سورۃ الجن:۱) کہ ہم نے ایک عجیب اور انوکھا قرآن (کلام) سنا۔

قرآن کی یہی تاثیر تھی جس کی وجہ سے قریش نہیں چاہتے تھے کہ کوئی قرآن سنے تاکہ اس کے قرآن سے متاثر ہوکر ایمان لانے کا خطرہ باقی نہ رہے۔ چنانچہ وہ اپنے لوگوں کو اس بات کی تلقین کرتے تھے جسے قرآن نے خود نقل کیا ہے کہ: ﴿ لا تسمعوا لهذا القرآن و الغوا فيه لعلكم تغلبون ﴾ (سورہ فصلت:۲۶) یعنی قرآن نہ سنو اور جب پڑھا جائے تو خوب شور مچاؤ، اس طرح شاید تم جیت سکو، ورنہ تو ناکامی ہی تمھارا نصیب ہے۔ اس طرح دانستہ یا نادانستہ وہ قرآن کی معجز بیانی، سحر طرازی اور اثر انگیزی کے معترف تھے۔

قرآن کریم کی اس تاثیر کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے براہ راست عقل انسانی کو اپنا مخاطب بنایا ہے اور اس کے خطاب میں انسان کے صحیح جذبات اور انسانی احساسات وشعور کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے بیان و اسلوب میں شوکتِ الفاظ، رفعتِ مضامین، عبارت کا حسن و جمال، آواز کا زیر و بم اور اتار چڑھاؤ، نظم و تالیف، ترتیب وتنسیق وغیرہ بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ایک ہی معنی کو مختلف پیرایۂ بیان میں پیش کرنا، کہیں بار بار ایک ہی جملے کی تکرار کرنا اور پھر اس تکرار کی وجہ سے پڑھنے والے پر کسی قسم کی گرانی کا نہ ہونا، یہ بھی قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ نیز قرآن معانی ومعقول چیزوں کو محسوس انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ وہ چیز مشاہد ہوکر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے لیے قرآن کریم کبھی استعارہ، تشبیہ اور کنایے کو کام میں لاتا ہے اور کبھی صاف و دلکش اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ لیکن کہیں بھی حسن و جمال کا دامن چھوٹنے نہیں پاتا اور کلام کی تاثیر میں ذرا بھی کمی نہیں آتی ہے۔ یہی دراصل اس کا اعجاز ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن پاک کے اعجاز بیان نے انسانوں کے ہر طبقے کو ہر دور میں حیرت زدہ کررکھا ہے۔ (مفتی سید احمد اللہ بختیاری۔ کاروان ادب جلد ۱۵، شمارہ ۳، اکتوبر دسمبر ۲۰۰۸ ص ۳۸-۳۹ بتغیر یسیر)

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کے اس دعوے اور چیلنج پر صرف یہی نہیں کہ پورے عرب نے ہار مان لی اور سکوت اختیار کیا بلکہ اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کا اور اپنے عجز کا کھلے طور پر اعتراف بھی کیا ہے۔ اگر یہ کسی انسان کا کلام ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ سارا عرب بلکہ ساری دنیا اس کا مثل لانے سے عاجز ہوتی۔ یہ ہے قرآن کا وہ کھلا ہوا معجزہ جس کا دشمنوں کو بھی اعتراف کرنا پڑا ہے۔ حضرت مولانا عبد اللہ مغیثی صاحب قرآن کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

''قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کا ایسا جامع کلام ہے جس

میں تمام علوم موجود ہیں۔اس کی وسعتِ معانی و رفعتِ مضامین کا یہ عالم ہے کہ نطق اس کے بیان سے عاجز اور فہم وہاں تک پہنچنے سے قاصر ہے۔ اس کے محامد کا شمار، اس کے مکارم کا بیان، اس کے علوم کی تحدید اور اس کے معانی کی تشریح طاقتِ بشری سے بالاتر ہے۔کیونکہ قرآنی الفاظ کی تہہ میں اسرار کا ایک بحرِ زخار موج زن ہے۔ اربابِ بصیرت جب اس میں غوطہ لگاتے ہیں تو انھیں بے شمار علم وحکمت کے موتی ہاتھ لگ جاتے ہیں۔قرآن کریم کی امتیازی شان اور اس کے رموز واعجاز کا یہ عالم ہے کہ اسے سن کر جنات یہ کہے بغیر نہ رہ سکے: ﴿ إنا سمعنا قرآناً عجباً يهدي إلى الرشد فآمنا به ﴾ (سورہ الجن:۱) (مولانا عبد اللہ مغیثی، کاروانِ ادب ، جلد ۱۵، شمارہ۲، جولائی ستمبر۲۰۱۵،ص۱۱)

''حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''الفوز الکبیر'' میں لکھا ہے کہ قرآن پاک نہ شعر ہے نہ نثر، اس کے باوجود حق تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایک جاذبیت، کشش اور بلا کی مقناطیسیت رکھی ہے۔ فطرتِ انسانی میں جو موزونیت اور تناسب رکھا ہے، فطرت کی اسی موزونیت کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن پاک کے اوزان و الفاظ اور الفاظ و آیات کا نظم و ترکیب خود ایک معجزہ ہے۔اسی لیے قرآن پاک فطرتِ انسانی کو موہ لیتا ہے اور دل اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔'' (مولانا عبد اللہ مغیثی، کاروانِ ادب ، جلد ۱۵، شمارہ ۲، جولائی ستمبر ۲۰۱۵،ص۱۳)

یوں تو پورا قرآنِ کریم اور اس کی ہر ہر آیت اپنے اندر بیشمار درسہائے عبرت رکھتی ہے اور اس میں عقلمندوں کے غور وفکر کے لیے بہت سی چیزیں ہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند آیتیں آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔آپ ان کی معنویت اور گہرائی و گیرائی کا اندازہ خود ہی لگا سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی ایک آیت کا مختصر سا ٹکڑا ہے: ﴿ و لا تكونوا كالذين نسوا الله فأنساهم أنفسهم ﴾ (الحشر: ۱۹) کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو کہ جنھوں نے اللہ کو بھلایا تو اللہ نے ان کو ایسا بنا دیا کہ وہ اپنے ہی کو بھول گیے۔ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''تمدن کے شاید کسی دور میں اس آیت کا ظہور اس طرح نمایاں اور صاف طریقے پر نہ ہوا ہو جتنا اس دورِ تہذیب و ترقی میں، انسان کا اپنی ذات کے معاملات میں انہماک، اپنی ذات سے شیفتگی شاید اتنی کسی زمانے میں نہ پیدا ہوئی

ہو جتنی اس دور میں۔خود پرستی کا فلسفہ شاید کسی عہد میں ایسا مرتب نہ ہوا ہو اور اس کی اشاعت شاید کبھی اتنے بڑے پیمانے پر نہ ہوئی ہو جیسی اس زمانے میں۔ اپنے سوا ہر چیز کے انکار کا ذوق اور جوش شاید کبھی اتنا عام نہ ہوا ہو جتنا اس موجودہ سوسائٹی میں۔لیکن واقعہ اور دن رات کا مشاہدہ کیا ہے؟ کیا یہ نہیں کہ انسان اپنے حقیقی مسائل سے سب سے زیادہ غافل ہے؟ اپنے انجام سے سب سے زیادہ بے فکر ہے؟ اپنی ذات سے سب سے زیادہ بے پروا ہے؟ حقیقی لذت وراحت سے سب سے زیادہ محروم ہے؟ زندگی کے ذخیرے میں اس کا اپنا حصہ سب سے زیادہ کم ہے۔وہ روپیہ ڈھالنے کی مشین بن کر رہ گیا ہے جو اپنے ڈھالے ہوئے سکوں سے خود فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔اس کا حصہ زندگی میں صرف اتنا ہے کہ اس کو اتنا تیل دیا جاتا رہے جس سے وہ چلتی رہے۔جذبات واحساسات سے عاری، لذت والم سے محروم،مسرت وکلفت سے بے خبر ایک بے جان مشین ہے۔''

(افادات قرآنی صفحہ ۵۴)

سورۂ ابراہیم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿ ألم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت و فرعها في السماء ، تؤتي أكلها كل حين بإذن ربها ، و يضرب الله الأمثال للناس ، لعلهم يتذكرون ﴾ (سورہ ابراہیم:۲۴-۲۵) ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاک بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے؟ (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو، اور شاخیں آسمان میں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو، اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے تاکہ وہ نصیحت پکڑیں۔

آپ اندازہ لگائیے کہ اس مختصر سی آیت میں اسلام کی پوری تاریخ آ گئی ہے۔اس کا مکانی رقبہ بھی آ گیا اور زمانی رقبہ بھی۔اس کی بنیاد اور اس کا سرچشمہ بھی آ گیا اور اس کے نقطۂ عروج کی داستان بھی۔

﴿ ادع إلى سبيل ربك بالحكمة و الموعظة الحسنة ، و جادلهم بالتي هي أحسن ﴾ (النحل: ۱۲۵) آپ اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلائیے حکمت سے اور اچھی نصیحت سے اور ان کے ساتھ بحث کیجیے پسندیدہ طریقے سے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حکمت کا لفظ بہت ہی بلیغ اور بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔دوسری زبان میں اس کا ترجمہ آسان

نہیں ہے۔ اسی طرح ''موعظت'' بھی وسیع معانی پر حاوی لفظ ہے۔ ''حسنہ'' کا لفظ بھی لا محدود معانی پر مشتمل ہے۔ قرآن نے اس آیت میں آزادی بھی دی ہے اور حد بندی بھی کی ہے۔ ایجاز و اختصار بھی ہے اور بیان و شرح بھی۔ حکمت سے مراد ہے عقل، دانائی، سلیقہ، حسن تدبیر، سچی اور صحیح بات کو واضح کر کے دل میں اتارنے کا طریقہ، اس طرح کہ مداہنت یا موقع پرستی کا شائبہ نہ ہونے پائے۔ سیاست کا اس میں دخل نہ ہو، سیاست الگ چیز ہے اور حکمت و موعظت الگ ہے۔'' (افاردات قرآنی صفحہ ۸۳)

﴿ یا أیھا الذین آمنوا اصبروا و صابروا و رابطوا ، و اتقوا اللہ لعلکم تفلحون ﴾ (سورہ آل عمران: ۲۰۰) ترجمہ: اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو،'' و صابروا '' اور صبر کی فضا پیدا کرو، صبر کا ماحول پیدا کرو، ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرو، صبر کی ترغیب دو، '' و رابطوا '' اور جمے رہو، سرحد کی حفاظت کرو، سرحدوں پر جمے رہو،'' و اتقوا اللہ '' اور اللہ سے ڈرو، احتیاط سے کام لو، اللہ کو حاضر و ناظر سمجھ کر کام کیا کرو، '' لعلکم تفلحون '' تا کہ تم کامیاب ہو۔

آج ہندستان میں ظلم و ستم کا جو بازار گرم ہے۔ مسلمان پوری طرح مظلوم ہیں۔ اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے درپے آزار ہیں۔ مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ ایسے میں یہ قرآنی اعجاز ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے نازل ہوئی ہے کہ اے ایمان والو! صبر سے کام لو،'' و صابروا '' اور جمے رہو، دیوار بنے رہو، ان فسادات ، ان نازک حالات، ان حملوں، تعدیوں، دست درازیوں اور خونریزیوں اور اس بہیمیت اور سفاکیت کے مقابلے میں چھاؤنی بنے رہو۔

یہ ہیں چند نمونے اعجاز و ایجاز کے اور ارشاد و ہدایت کے، جو بطورِ مثال پیش کیے گیے۔ ورنہ قرآن تو ایک بحر ذخار ہے جس کا نہ اور ہے نہ چھور ہے۔ اس کی گہرائی و گیرائی کا اندازہ لگانا انتہائی مشکل و دشوار ہے۔ اس کا تو ہر ہر لفظ کسی بیش قیمت موتی کی طرح آبدار ہے۔

رباعیاتِ امجد میں روحانی تجربے

پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی
(علی گڑھ)

مثنوی، نظم اور غزل کے مقابلے میں رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔ رباعی میں تفصیل کا موقع نہیں ہوتا۔ بات اختصار سے کہی جاتی ہے۔ اور مخصوص بحر میں چار مصرعوں میں مکمل کی جاتی ہے۔ حکمت و دانائی اور فلسفہ و معرفت کے نکات بھی اشاروں میں ادا کیے جاتے ہیں۔ یہاں دریا کو کوزے میں بند کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک مشکل فن ہے جو ہر کسی کو نہیں آتا۔ اسی وجہ سے غزل اور نظم گو شعرا کے مقابلے میں رباعی گو شعرا کم ہیں۔

اردو رباعیات میں ماضی قریب کے شعرا میں معتبر نام امجد حیدر آبادی کا ہے۔ انھوں نے اپنی رباعیوں سے اردو شاعری اور اردو ادب کو مالا مال کیا ہے۔ امجد کا پورا نام سید احمد حسین اور تخلص امجد ہے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے جامعہ نظامیہ حیدر آباد میں حاصل کی۔ سولہ برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ ایک عرصے تک نظم اور غزل میں طبع آزمائی کی۔ پھر رباعی کو اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور آخر تک اسے نبھایا۔ ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں موسیٰ ندی میں سیلاب آیا تو گھر بار، بیوی، بیٹی اور ماں کے ساتھ ان کی رباعیوں کے مسودے کو بھی غرقاب کر دیا۔ وہ اس حادثۂ جانکاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''میرے بچپن کے زمانے کی اردو، فارسی رباعیاں آج سے تقریباً بیس برس پہلے طبع ہو چکی تھیں۔ لیکن کامل اشاعت کے قبل اکثر جلدیں طغیانیِ رودِ موسیٰ ۱۳۲۶ھ میں میرے تمام خاندان کے ساتھ دریا برد ہو گئیں کہ گفتہ اند: نکوئی کُن و در آب انداز۔ اب یہ نئی رباعیاں پیش کی جاتی ہیں''۔

امجد کی رباعیوں کے تین حصے ہیں۔ تینوں ایک ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ رباعیات کے اس مجموعے میں کم تر فارسی کی رباعیاں ہیں اور بیش تر اردو کی رباعیاں۔ یہ عام فہم انداز میں علم و معرفت کے موتی لٹاتی ہیں۔ ان رباعیوں میں رندی، بادہ خواری، عشق و ہوس، آوارگیِ فکر، بے ہودہ خیالی اور فسق و فجور نام کو نہیں ہے۔ بلکہ علمی و فکری مضامین، عارفانہ نکات، اصلاحی خیالات، اخلاقی اور تہذیبی مسلمات سادگی اور پرکاری کے ساتھ ادا کیے گیے ہیں۔ یہاں لفظوں کی بازی گری

نہیں ہے۔ بلکہ معنی آفرینی ہے اور یہی امجد حیدر آبادی کے کلام کی خوبی ہے۔ اسی لیے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کو حکیم الشعراء کا خطاب دیا ہے۔

رباعیات کے فن میں امجد حیدر آبادی کا کیا مقام ہے، اس پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر وحید الدین سلیم نے لکھا ہے:

''یہ ان شعرا میں نہیں ہیں جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لیے ہوش ربا ہے۔ وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے۔ پھر وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں۔ خود خیال ہی اپنے لیے لباس تیار کر لیتا ہے اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ قدرتی شاعر کی یہی پہچان ہے۔ ان کی منتخب رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی''۔

امجد کی رباعیات میں معنی خیزی اور وارفتگی کے ساتھ بے ساختگی بھی پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں تکلف و تصنع بہت کم ملتا ہے۔ وہ اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں:

''اعلیٰ سلسلۂ خیال کا صحیح اور سلیس ترکیب میں وہ بھی بے ساختہ پن کے ساتھ ادا کرنا (جو کمالِ ادب ہے) اختیاری بات نہیں ہے۔ وہی تصنیف زیادہ تر مقبول اور پسندِ خاطر ہوتی ہے جس میں اعلیٰ خیال کے ساتھ بے ساختہ پن ہو''۔

امجد کا شعری نظریہ :

حضرتِ امجد حیدر آبادی مقصدِ زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لیے ان کی رباعیاں مقصدیت لیے ہوئے ہیں۔ ان کی رباعیوں میں پاکیزہ فکر و خیال کی مہک ہے اور روحانی تجربات کی دھنک ہے۔ وہ اپنے شعری نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

'' تکلف اور لطائفِ شاعری سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ زباں گیر، دل شکن حرف گیروں کی خاطر سے میں نے اپنے مذاق میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ محض ضمیر کی اس آواز کو (جو مبدأ فیاض کا فیضانِ خاص ہے) اپنی زبان اور سادہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے''۔

لطفِ سخن بظاہر سماعتوں کو اچھا لگتا ہے مگر اس سے عقل و فکر اور زبان و ادب کی تہذیب نہیں ہوتی اور نہ انسانی رویے میں تبدیلی آتی ہے۔ بلکہ انسانی قلب پر ایک طرح کا حجاب بن جاتا ہے۔ اس کی حکمت بتاتے ہوئے امجد کہتے ہیں:

کہتے ہیں جسے لطفِ سخن حضرتِ امجد
لفظوں کی الٹ پھیر ہے اور کچھ بھی نہیں ہے
روشن ہے مہ و مہر مگر اس پہ بھی دن رات
اندھیر ہی اندھیر ہے اور کچھ بھی نہیں ہے

حضرتِ امجد کا خیال ہے کہ اچھی شاعری کے لیے بندشِ الفاظ، نظمِ کلام اور موزونیت ہی کافی نہیں ہے بلکہ فکر کی بلندی، خیال کی پاکیزگی اور جذبات کی نفاست بھی ضروری

ہے ۔ شاعر چست فقرے بنا سکتا ہے ۔ حسین لفظی پیکر بھی تراش سکتا ہے مگر تاثیر پیدا نہیں کرسکتا۔ وہ کہتے ہیں:

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے
مضمونِ بلند لا مکاں سے لائے
ہر شعر باعتبارِ فن خوب کہا
لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

حضرتِ امجد کہتے ہیں کہ شاعری کا اصل مقصود حرف وصوت نہیں ہے بلکہ دل میں اتر جانے کی قوت ہے ۔ یہ قوت جس شعری پیرایے میں پیدا ہوتی ہے ، اس میں تاثیر پیدا ہوجاتی ہے ۔ امجد ادب برائے ادب کے قائل نہیں، وہ ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

نغمہ کا ہے شوق لحنِ داود نہیں
اس طرز میں حمد کی کہ محمود نہیں
سننے والے سے آہ بھی تو نکلے
ایک واہ ہی شاعر کا مقصود نہیں

شاعر جب واہ واہی کو اپنا مطمحِ نظر بنالیتا ہے تو اس کی نظر میں پستی ، خیال میں خفت اور شعر میں سوقیانہ پن آجاتا ہے۔ اور اگر وہ مقصدِ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کا شعری سرمایہ لافانی بن جاتا ہے اور اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں۔

حضرتِ امجد نے علم ومعرفت اور اصلاحِ نفس کو اپنی رباعیات کا موضوع بنایا۔ اس سے ان کے کلام میں تاثیر پیدا ہوئی ۔ امجد اپنے شعری کلام کی تاثیر سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں، جن مقاصد کے تحت کہتے ہیں اور جن لوگوں کی تربیت کے لیے کہتے ہیں، اس میں ان کی شعری کاوش کامیاب ہے اور مخلوق پر اثر رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہر نقطہ و حرف کام کرجاتا ہے
دامنِ گل معرفت سے بھر جاتا ہے
امجد کا کلام کوئی خنجر تو نہیں
کیوں دل میں ہر ایک کے اتر جاتا ہے

امجد کی زندگی میں ان کی بہت سی رباعیات زبان زدِ خاص وعام ہوگئی تھیں۔ ان رباعیوں میں اخلاقی پیغام اور معنی آفرینی کے ساتھ صنعتِ لفظی کا بھی دلچسپ استعمال ہے۔ مثلاً:

ہم صحبتِ بے خرد پریشان رہا
نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی
نادان کو الٹا بھی تو نادان رہا

خاص بات یہ ہے کہ ان رباعیوں میں سماجی اصلاح اور زبان و دل کی پاکیزگی کا پیام ہے ۔ قرآن کا حکم ہے کہ لوگوں سے نرم اور احسن بات کیجیے۔ سخت اور گرم بات نہ کیجیے۔ ﴿ و قولوا للناس حسنًا ﴾ امجد حیدرآبادی نے اس روحانی پیغام کو نہایت حسین پیرایے میں عوامی دل وزبان تک اس طرح پہنچایا ہے:

کہو وہ بات جس میں ہو کرامات
سخن ہی حاصلِ دنیا و دیں ہے

نہ کہے سخت بات امجد کسی سے
زباں میں دیکھیے ہڈی نہیں ہے

امجد حیدر آبادی نے قرآنی آیات، رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، حکما کے مقولات اور بزرگوں کے ملفوظات کو اپنی رباعیات کا سرنامہ بنایا ہے۔ پہلے وہ کوئی پاکیزہ روحانی اور اخلاقی نکتہ تلاش کرتے ہیں، پھر اس کے شایانِ شان لفظی پیکر تراش لیتے ہیں۔ مثلاً قرآنِ پاک نے نیکی و بدی کا فلسفہ اس طرح بیان کیا ہے: ﴿ إن الحسنات يذهبن السيئات ﴾ (نیکیاں برائیوں کو کھا جاتی ہیں)۔ حضرتِ امجد کی نظر میں نیکیوں کی مکمل شکل نماز ہے اور اسے شعری پیرایے میں اس طرح پیش کرتے ہیں:

پیراہنِ کبر چاک ہوجاتا ہے
نفس سرکش ہلاک ہوجاتا ہے
مسلم کے لیے عجیب نعمت ہے نماز
سر خاک میں رکھ کر پاک ہوجاتا ہے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ فاذكروني أذكركم ﴾ (تم مجھے یاد کرو میں تمھیں یاد کروں گا)۔ اس فکرِ پاکیزہ کو پیراہن رباعی میں یوں پیش کیا ہے:

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں
جب تو سنتا ہے، کیوں نہ فریاد کروں
میں یاد کروں تو ، تو مجھے یاد کرے
تو یاد کرے تو میں نہ کیوں یاد کروں

حقیقت بینی :

امجد اپنی رباعیوں میں جس معرفت کی ترجمانی کرتے ہیں اس کی پہلی منزل حقیقت بینی ہے۔ جب انسان حقیقت کو بے تعصب اور پاک نگاہوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر اسرارِ جہاں منکشف ہونے لگتے ہیں۔ اسی لیے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی ہے کہ اے اللہ! جو چیز جیسی ہے ویسی ہی مجھے دکھا: " اللهم أرنا الأشياء كما هي " ۔ امجد نے حقیقت بینی کو اپنی رباعی میں اس طرح پیش کیا ہے:

ہر قطرے میں بحرِ معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرے میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی
گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

معرفت کی اعلیٰ منزل یہ ہے کہ انسان کو خالقِ حقیقی کی معرفت حاصل ہوجائے اور یہ ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ امجد معرفتِ الٰہی کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہے شاہدِ حسن ہر جگہ پردے میں
ملتی نہیں کسی کو رہ پردے میں
اس کا ہر ایک راز کعبے کی طرح
پردے میں ہے اور وہ بھی سیہ پردے میں

اس پردہ داری کے باوجود اللہ تعالیٰ نے بندوں سے بہت قریب رہنے کا اعلان کیا ہے۔ اللہ کہتا ہے کہ "میں انسان

کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہوں''۔ بندہ اگر خدا کو دیکھنا چاہے، محسوس کرنا چاہے اور کلام کرنا چاہے تو وہ رنج و راحت میں، خوشی اور غم میں یہاں تک کہ اپنی ہر سانس میں اسے محسوس کرسکتا ہے۔ امجد حیدر آبادی نے اس احساسِ لطیف کو اپنی رباعی میں بڑی ژرف نگاہی سے سمویا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

غم میں رخِ مقصود نظر آتا ہے
جلتی ہوئی شاخ میں ثمر آتا ہے
ہے زخمِ جگر میں تیری ہنستی صورت
ہر چوٹ کے ساتھ تو ابھر آتا ہے

ایک اور رباعی میں وہ کہتے ہیں:

کچھ اپنا پتہ اس نے بتایا تو نہیں
اب تک اس کا سراغ پایا تو نہیں
ملتی ہوئی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے
دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں

امجد کی رباعیات میں عرفانِ ذات، مطالعۂ انفس اور احتسابِ نفس بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ انسان کے داخلی جوہر کو انسانی وجود کا ماحصل سمجھتے ہیں اور اس کی تعدیل و تہذیب کو انسانی مشن قرار دیتے ہیں۔ نیز اس کو اعلیٰ روحانی قدروں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیتے ہیں۔ کیونکہ اس میں صفاتِ خداوندی جلوہ گر ہیں۔ اس وجہ سے امجد کی شاعری روحانی قدروں کی نقیب بن گئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

ہر مرتبہ آئینۂ دل دھلتا ہے
کانٹا کانٹا نگاہ میں تلتا ہے
میں شاعری کو مراقبہ کیوں نہ کہوں
ہر فکر میں بابِ معرفت کھلتا ہے

امجد اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنے کی اور عزتِ نفس کی حفاظت کرنے کی لوگوں کو تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خود اپنی ذات سے محبت کیجیے
جتنا ممکن ہو اپنی عزت کیجیے
مجموعۂ آیاتِ الٰہی ہے تُو
قرآنِ وجود کی تلاوت کیجیے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر بنایا ہے اور وہ انسان کے اندر اپنی صفات کا پرتو دیکھنا چاہتے ہیں۔ امجد اپنی ذات میں خدا کی صفات کا عکس دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

لہریں کیا گن رہے ہو دریا دیکھو
آئینۂ دل میں روئے مولیٰ دیکھو
اللہ اللہ کرتے ہو کیا دن رات
آنکھیں ہوں تو اسم میں مسمّیٰ دیکھو

خدا کے بعد خاتم المرسلین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت امجد کا شوقِ دروں ہے۔ اس محبت نے ان کی رباعیات میں ڈھل کر جذب و کیف اور سرشاری کی لذت پیدا کی ہے جو قاری کو

مسرور اور مسحور کر دیتی ہے۔ حضرت ختمی مرتبت محمد صلی اللہ علیہ و سلم کی نعت میں کہی گئیں امجد کی رباعیاں ایمان کی حلاوت اور زبان وادب کی ندرت رکھتی ہیں۔ دیکھیے:

رخ مہر، قد خط شعاعی کی طرح
وہ گلۂ امت میں ہے راعی کی طرح
اس خاتمِ انبیا کا آخر میں ظہور
ہے مصرعہ آخرِ رباعی کی طرح

خانۂ کعبہ کو دل سے اور مدینہ منورہ کو آنکھوں سے تشبیہ دے کر امجد نے جو معنی آفرینی ہے، اس کا نمونہ دیکھیں:

ہیں خاتمِ عشق کا نگینہ آنکھیں
ہیں بحرِ محبت کا سفینہ آنکھیں
ہیں گنبدِ پُر نور کی صورت بالکل
کعبہ ہے اگر دل تو مدینہ آنکھیں

زندگی اور موت :

زندگی ایک حقیقت ہے اور موت اس سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر عموماً انسان اس بڑی حقیقت سے غافل رہتا ہے۔ زندگی کے جھمیلوں میں رہ کر وہ انجام سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زندگی ناشاد اور بے مراد ہو جاتی ہے۔ اس خاکی جسم کو فنا ہونا ہے اور روح باقی رہنے والی ہے۔ روح کی پاکیزگی کے لیے انسان کو جد و جہد کرنی چاہئے۔ موت جسم کی لذت اور دنیا کے مزے کو ختم کر دے گی اور ایک نئی دنیا میں لے جائے گی جہاں جوابدہی اور جزا و سزا کا محشر ہوگا۔ امجد حیدر آبادی کی رباعیوں میں زندگی اور موت کا فلسفہ باریکی کے ساتھ در آیا ہے اور انسان کو اپنے انجام سے اس طرح روشناس کراتا ہے:

کیا وقت گزر رہا ہے نادانی میں
بیٹھے ہیں نسیجت عالمِ فانی میں
جس عمر پہ ہے گھمنڈ اتنا ہم کو
ہے دھوپ میں برف یا نمک پانی میں

انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اس کو حسبِ ذیل رباعی میں بیان کیا ہے:

ہر دم رہیں ذکرِ حضرتِ باری میں
دن رات گزریں گریہ و زاری میں
مقصود یہی ہے زندگی کا امجد
مصروف رہیں موت کی تیاری میں

فنا اور بقا :

حضرتِ امجد نے فنا اور بقا کے گہرے تصور کو بھی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنی رباعیوں کی زینت بنایا ہے۔ اس میں معنی آفرینی بھی ہے اور تغزل کی شوخی بھی۔ مثلاً وہ حسن کا انجام بتاتے ہوئے حسن پرستوں سے کہتے ہیں:

اک دن یہ مہِ حسن گہن میں ہوگا
فریاد کا شور انجمن میں ہوگا
اس پھول سے تن پہ خاک پڑ جائیگی
گورا گورا بدن کفن میں ہوگا

فنا انجام حسن سے گزر کر حسنِ کامل کی طرف جانا بقا کا راز ہے۔اس راز کی پردہ کشائی حضرتِ امجد نے اس طرح کی ہے:

واجب ہی کو ہے دوام ،باقی فانی
قیوم کو ہے قیام ، باقی فانی
کہنے کو زمین و آسماں سب کچھ ہے
باقی ہے اسی کا نام ، باقی فانی

لطفِ بندگی :

انسان اللہ کا بندہ ہے اور اللہ کی تمام مخلوق میں سب سے بہتر ہے بشرطیکہ مالک کو پہچانے۔اپنے مالکِ حقیقی کو پہچاننا ،اس سے لو لگانا ،اس کے آگے سر جھکانا ، یہی بندے کی شان ہے۔یہ بندگی مومن کا مقام بلند کرتی ہے اور اسے کائنات کا امین بنا دیتی ہے۔امجد حیدر آبادی نے اس روحانی نکتے کو جا بجا اپنی رباعیات میں پیش کیا ہے۔وہ کہتے ہیں:

بندہ ہے تو بندگی پہ قائم ہوجا
مخدوم نہ بن کسی کا خادم ہوجا
مومن ہے تو ڈھونڈھ لے کوئی امن کی جائے
مسلم ہے تو سر جھکا کے نادم ہوجا

انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ نیاز جھکا دے۔خاکی بدن خاک پہ آجائے۔زمین پر سجدہ کرنے کو عرش کی بلندی سے تعبیر کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں:

سجدہ تیرے در پر ہے مقدر میرا
نقشِ قدمِ پاک ہے محور میرا
پہونچا دیا عرش تک تری ٹھوکر نے
چمکا تری خاکِ پا سے جوہر میرا

توبہ :

خطا اور نسیان انسان کی پیدائشی کمزوری ہے۔وہ کون ہے جس سے خطا نہیں ہوئی ؟ مگر انسان کی خوبی اس میں ہے کہ اگر غلطی کرے تو نادم ہو،خطا کرے تو توبہ واستغفار کرے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''ہر بنی آدم خطا کار ہے اور بہترین خطا کار وہ ہے جو توبہ کرے''۔توبہ ایک بہترین پتوار ہے جو کشتیِ حیات کو طوفانِ حوادث سے بچا کر ساحلِ مراد تک لے جاتا ہے۔امجد حیدر آبادی کی رباعیات میں یہ روحانی تجربہ نہایت سلیقے اور فنی مہارت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔وہ کہتے ہیں:

نادانی سے پہلے تو خطا کرتے ہیں
ہٹ کر کے پھر اور بھی برا کرتے ہیں
جب تم سے کوئی گنہ ہو تو توبہ کرلو
میلے کپڑے کو دھو لیا کرتے ہیں

توبہ سے انسان پاک ہوجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں منہ دکھانے کے لائق ہوجاتا ہے۔امجد حیدر آبادی اس وارداتِ قلبی کو یوں بیان کرتے ہیں:

جب اپنی خطاؤں پہ میں شرماتا ہوں
اک خاص سرور قلب میں پاتا ہوں

توبہ کرتا ہوں جب گنہ سے امجد
پہلے سے زیادہ پاک ہوجاتا ہوں

دعا:

انسان کا وجود دنیا کے مسائل سے گھرا ہوا ہے اور آخرت کی نجات کا طالب ہے ۔ اس لیے دعا انسان کی ضرورت بھی ہے،غم واندوہ کے ہجوم میں مونس بھی ہے اور خالق ومالک سے تعلق کا واسطہ بھی ہے۔دعا بندے کا ہتھیار ہے۔دعا مومن کی شان ہے۔دعا عبادت ہے بلکہ عبادت کی جان ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میرے بندو! مجھ سے مانگو، میں ضرور تمھاری فریاد سنوں گا ، میں تمھاری مدد کروں گا اور ایسے طریقوں سے کروں گا کہ تمھارے وہم وگمان میں نہ ہوگا۔

امجد حیدر آبادی نے دعا کو اپنی رباعیات میں نہایت حسین پیرایے میں اور موثر انداز میں موضوع بنایا ہے ۔ یہ زبان پر طاری ہوتی ہے اور دل میں اتر جاتی ہے۔حضرتِ امجد فرماتے ہیں:

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو
منت سے سماجت سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو
بندہ ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ایک دوسری رباعی یوں ہے:

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹاتے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

حضرتِ امجد نے کہیں تو دعا کو بابِ رحمت کہا ہے اور کہیں اللہ سے مصافحہ کرنے کی پاکیزہ تعبیر استعمال کی ہے۔وہ کہتے ہیں:

بندہ ہے مگر خدا کا دم بھرتا ہے
پروانہ ہے شمع سے نہیں ڈرتا ہے
جب ہاتھ اٹھاتا ہے دعا میں مسلم
اپنے رب سے مصافحہ کرتا ہے

دعا میں جو عجز وانکسار اور لذتِ بندگی ہے، اس کی نقاب کشائی کرتے ہوئے امجد فرماتے ہیں:

سناؤں کس کو سوا تیرے اپنا افسانہ
مگر یہ ڈر ہے کہ خاطر تیری ملول نہ ہو
اٹھاؤں سر نہ کبھی تیرے آستانے سے
مری دعا ہے کہ میری دعا قبول نہ ہو

مسلمان پوری دنیا میں ہر روز ہر وقت دعا کرتے ہیں۔ پانچ وقت نمازوں میں،ضرورت وحاجت کے وقت اور غیر معمولی حالات میں ۔مگر ہمیں شکوہ ہے کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوتی ہے۔دعائیں اثر سے کیوں خالی ہوگئیں؟ امجد حیدر آبادی اس کا راز یہ بتاتے ہیں:

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں
پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں

کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز
کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

رنگ تصوف :

حضرتِ امجد صوفی منش شاعر تھے۔خود اپنے بارے میں کہتے ہیں:

آیا ہے زمانہ ترقی
گندہ بندۂ خدا ہوا ہے
ایمان سے دل کو صاف کر کے
امجد صوفی بنا ہوا ہے

وہ صوفیانہ خیالات اور وارداتِ نفسی کو بھی اپنی رباعیوں میں بیان کرتے ہیں ۔ خاص طور پر محی الدین ابن عربی کے نظریۂ وحدۃ الوجود سے متاثر تھے ۔ چنانچہ وجودی تصوف کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جو صورتِ مضموں ہے وہی عنواں ہے
واجب ہی میں اک صورتِ امکاں ہے
محشر ہو کہ قبر زندگانی ہو کہ موت
جو یاں ہے وہاں ہے جو وہاں ہے یاں ہے

اسی خیال کی مزید تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

تن میں جاں کا نمود کیوں کر دیکھوں
اس جامے کا تار و پود کیوں کر دیکھوں
روئی نظر آتی نہیں پیراہن میں
مجھ میں تیرا وجود کیوں کر دیکھوں

اصلاحِ معاشرہ :

امجد نے اپنی رباعیات کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ اور عوامی تزکیے کا بھی کام کیا ہے ۔ وہ معاشرے کے مختلف طبقات میں رائج برائیوں کو نشانہ بناتے ہیں اور ان کی اصلاح کی فکر کرتے ہیں۔ان کی رباعیاں سماج کے ناسور کے لیے نشتر کا کام کرتی ہیں۔وہ تاجر طبقے کو تنبیہ کرتے ہیں:

آسائشِ جسم کے لیے جان نہ بیچ
اور جان بچانے کے لیے آن نہ بیچ
بھولے گاہک کو ٹھگنے والے تاجر
سامان کے ساتھ اپنا ایمان نہ بیچ

وہ دنیا پرست صوفیہ اور زر پرست پیروں کو ہدفِ ملامت بناتے ہیں اور دین کے پردے میں دنیاداری کی کوشش کی مذمت کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

کس شان سے شیخ خود نما بیٹھا ہے
سچ مچ کوئی سمجھے کہ خدا بیٹھا ہے
صورت میں ہے بایزید، سیرت میں یزید
چمڑے پہ ہرن کے بھیڑیا بیٹھا ہے

وہ مال داروں کو غربا پروری کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جب تک بس چل سکے کھلا لو کھا لو
سائل کو کبھی نہ اپنے در سے ٹالو
ممکن ہے کسی روز ہما بھی پھنس جائے
ہر اک طائر کو تم دانہ ڈالو

ناداروں کو محنت ومزدوری کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور مفت خوری کو حرام خوری کے مترادف سمجھتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

کام کرنے میں کوئی عیب نہیں
کام کرنا بھی کوئی چوری ہے
اہلِ غیرت کی شرع و ملت میں
مفت خوری حرام خوری ہے

امجد حیدر آبادی نے انسان کی داخلی کمزوریوں یا اوصافِ رذیلہ کی اصلاح کو بھی اپنی رباعیات کا موضوع بنایا ہے۔کبر وغرور،خودنمائی اور کم ظرفی جیسے انسانی رذائل پر نقد کیا ہے۔کم ظرفی کے بارے میں بڑا خوب صورت تبصرہ کیا ہے:

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے
مانندِ حباب ابھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس
تنکا تھوڑی ہوا سے اڑ جاتا ہے

خدمت خلق :

امجد نے اپنی رباعیوں میں دوسروں کے کام آنے، انسانوں کی خدمت کرنے اور مخلوق کی راحت رسانی میں وقت لگانے کی بڑی قدر و قیمت بتائی ہے۔وہ کہتے ہیں:

میاں امجد تمھاری جیسی مرضی
بنو کافر کہ تم اسلام لاؤ
مگر کہہ دیتے ہیں اک کام کی بات
جہاں تک ہو کسی کے کام آؤ

امجد نے اپنی فارسی رباعی میں خدمتِ خلق کی رفعت اور عنداللہ اس کی مقبولیت کا راز بھی بتادیا ہے:

از خدمتِ خلق بندہ اعلیٰ گردد
مستوجبِ فضلِ حق تعالیٰ گردد
ہمدردیِ بے کساں رساند بہ شرف
آتش چو نجس گرفت بالا گردد

مختصر یہ ہے کہ امجد حیدر آبادی کی رباعیاں علم و عرفان اور مقصدِ زندگی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ان میں اعلیٰ روحانی اصولوں کی ترجمانی ہے اور اخلاقی قدروں کی فراوانی ہے۔یہ رباعیاں اردو زبان کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہے جس سے اربابِ ذوق و ادب ہر عہد میں استفادہ کرتے ہیں۔

غزل

شہزاد احمد

لوٹنا چاہوں تو ملتا ہی نہیں رستا مجھے
یہ دلِ بے درد کس بستی میں لے آیا مجھے

یاد آتی ہیں شبِ تاریک کی تنہائیاں
زہر لگتا ہے چراغِ شام کا جلنا مجھے

میں نے سمجھا تھا کہ ہے نا آشنا ہر ایک شخص
شکر ہے اِس گھر کی ویرانی نے پہچانا مجھے

میری خوش بختی کہ میں ہوں جاگتی آنکھوں کا خواب
ٹوٹ بھی جاؤں اگر تو کچھ نہیں ہوتا مجھے

اب تو دلدل بن گئی ہے پیاس کی ماری زمیں
میری خواہش سے زیادہ دے گیا دریا مجھے

میں نے اپنے دل کے اندر کائناتیں دیکھ لیں
اپنی وسعت سے ڈراتا رہ گیا صحرا مجھے

دے دیا ہے جس نے مجھ کو زندگی بھر کا عذاب
کس قدر سفاک ہے مرنے نہیں دیتا مجھے

میں نے سوچا تھا کہ لے آؤں زباں پر دل کی بات
لیکن اِس قابل ابھی لگتی نہیں دُنیا مجھے

ضبطِ غم! میں ایک آنسو ہوں، تری دولت ہوں میں
میں اگر گر جاؤں، پلکوں سے اٹھا لینا مجھے

صبح کیسے خوش نظر آتے تھے میں اور آفتاب
رات کو روتے ہوئے اُس نے نہیں دیکھا مجھے

خیر میں نے بھی نہیں کی ہے تری پروا کوئی
اے زمانے! یاد تو نے بھی نہیں رکھا مجھے

اپنے رستے پر تری دُھن میں چلا جاتا تھا میں
میں بھٹک جاتا اگر تیرا خیال آتا مجھے

آج تو شہزاد نکلا ہی نہیں سُورج مرا
آج لگتے ہیں یہ سارے پیڑ بے سایا مجھے

غزل

شہزاد احمد

یار تو کیا غیر بھی آئے ہیں سمجھانے مجھے
کوئی تو سمجھے مجھے ، کوئی تو پہچانے مجھے

رات یاد آتی رہی اُس شخص کی ایک ایک بات
جمع کرنے پڑگیے بکھرے ہوئے دانے مجھے

بار بار آخر مرے ہی سر سے ٹکراتے ہیں کیوں
یہ در و دیوار تو لگتے ہیں دیوانے مجھے

پھُول کی خوشبو مرا دامن پکڑتی کیوں نہیں
پاس اپنے کیوں بُلا لیتے ہیں ویرانے مجھے

آتشِ غم کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے دل
شمع کی جانب لیے جاتے ہیں پروانے مجھے

اب تو خوف آتا ہے سورج کی تمازت سے مگر
دن ڈھلا تو رات آجائے گی تڑپانے مجھے

اب نہ جانے یہ ترا عقبیٰ کرے گا کیا سلوک
رات دن بے چین رکھا تیری دنیا نے مجھے

اپنی منزل سے بہت آگے نکل آیا ہوں میں
اب کہاں لے جائے گا رستہ خدا جانے مجھے

ساقیِ افلاک رشتہ ہے ستاروں سے مرا
عمر بھر گردش میں رکھتے ہیں یہ پیمانے مجھے

کوئی بھی محفل ہو میرا جی بہلتا ہی نہیں
ایک سے لگتے ہیں شاید اپنے بیگانے مجھے

ریزہ ریزہ ایک دن شہزاد میں ہوجاؤں گا
توڑ ڈالیں گے مرے اندر کے بُت خانے مجھے

ہر طرف سے گھیرتی جاتی ہے طغیانی مجھے
کیا بہا لے جائے گا یہ آنکھ کا پانی مجھے

میں شبِ غم کے اندھیروں سے اگر بچ بھی گیا
خاک کردے گی مرے اندر کی تابانی مجھے

فاصلے ہی فاصلے حدِّ نظر تک فاصلے
راس کب آئی ستاروں کی فراوانی مجھے

یہ حقیقت ہے کہ میں زندہ اُسی کے دم سے ہوں
سانس بھی لینے نہیں دیتی جو حیرانی مجھے

بس یہی ڈر ہے کہ اک دن پھر بچھڑ جائے گا تو
تیرے ہوتے اور کیا ہوگی پریشانی مجھے

کیا ملا مجھ کو سرابوں میں سمندر ڈھونڈکر
میں نے پہچانا مگر دنیا نہ پہچانی مجھے

دل میں اب آگے سفر کرنے کی خواہش بھی نہیں
لوٹنا چاہوں تو ہوتی ہے پشیمانی مجھے

اب تو کچھ باقی نہیں ترکِ تعلق کے سوا
اب محبت میں رہے گی اور آسانی مجھے

نیند میں ڈوبے ہوئے سبزے کو لہراتی ہے کیوں
صبح کی تازہ ہوا لگتی ہے دیوانی مجھے

اس تگ و دو میں کنارے تک نہیں پہنچا تھا میں
پھر بہا کر لے گئی دریا کی جولانی مجھے

دل سے جاتا ہی نہیں شہزاد اُس رُت کا خیال
زخم کتنے دے گئی پھولوں کی ارزانی مجھے

غزل

سعود عثمانی

حوصلہ چھوڑ گئی راہگذر آخرِ کار
رہ گیا ساتھ مسافر کے سفر آخرِ کار

کوہِ اسود نے بہت راستے روکے لیکن
شرق سے پھوٹ پڑا چشمۂ زر آخرِ کار

جس کے پتوں پہ لکیریں تھیں ہتھیلی جیسی
کٹ گیا میری طرح وہ بھی شجر آخرِ کار

ٹھیر جائے گی کسی روز لہو کی گردش
ختم ہوجائے گا اندر بھی سفر آخرِ کار

زرد ہوجائیں گے پتے بھی شگوفوں کی طرح
ایک ہوجائیں گے سب عیب و ہنر آخرِ کار

پیار کرنوں کا میسر نہیں آئے گا سعود
بند رہ جائے گا سیپی میں گہر آخرِ کار

غزل

ارتضیٰ نشاط

اِسی اک سوچ میں غرقاب جُو تالاب ملتا ہے
کہ دریا کس قدر گہرائی میں پایاب ملتا ہے

نہ جانے کیوں تمھارے در پہ آجاتا ہوں میں، ورنہ
جہاں میں ہوں، سکوں میرے لیے بیتاب ملتا ہے

بڑی تیزی سے کشتی جس طرف بہتی چلی جائے
ہمیشہ یاد رکھنا اُس طرف گرداب ملتا ہے

محبت میں ہمیشہ مرتبے نیچے اترتے ہیں
صدف سے ابرِ گوہربار زیرِ آب ملتا ہے

ہمیشہ کے لیے اے کاش یہ لمحے ٹھہر جائیں
کہ میری نیند سے اِس وقت اُس کا خواب ملتا ہے

مجھے معلوم ہے کیا چیز ہے رشتوں کی مجبوری
سدا رُستم کے خنجر کے تلے سہراب ملتا ہے

حقیقت ارتضیٰ کی آم کے پھل کی طرح سمجھو
بہت مِلتا ہے پھر بھی کس قدر کمیاب ملتا ہے

غزل

مرغوب حسین طاہر

ابھی کچھ اور مصروفِ دعا رہتا تو اچھا تھا
یہ دل خوش فہمیوں میں مبتلا رہتا تو اچھا تھا

یہ دل جو مصلحت اندیش ہونے سے گریزاں ہے
منافق موسموں میں بے صدا رہتا تو اچھا تھا

نویدِ فتح نے آپس میں کیسی پھوٹ ڈالی ہے
مری تو ملت کا نقشہ جما رہتا تو اچھا تھا

تجھے رنگیں ادا کوئی ضرورت تو نہیں پھر بھی
ہتھیلی پر تری رنگِ حنا رہتا تو اچھا تھا

افسانہ

زندگی عزیز ہے

سلطان جمیل نسیم

بڑے میاں کا اضطراب، ہمدردی کے انگاروں پر لوٹ رہا ہے۔ کمرے کی خاموش فضا کے سینے پر رکھی تنہائی کی برفانی چٹان، عبادت کے لیے آنے والوں کے وجود کی حرارت، باتوں کی گونج اور تنفس کی سرسراہٹ سے پاش پاش ہو چکی تھی، وہ کچھ دیر تک تو آنے والوں کے سوالات کا جواب دیتے رہے، مگر جب محسوس کیا کہ گفتگو کا رخ ان کے حوالے سے بڑھاپے کی شکایت اور حالات کے شکوے تک آن پہنچا ہے تو اپنی لاتعلقی ظاہر کرنے کے لیے، انھوں نے آنکھیں موند لیں، آنکھیں بند کر لینے سے دوسروں کی زبان تو بند نہیں ہو سکتی۔

بدبختو! جاتے کیوں نہیں ہو؟ اس صدی پر خون سفید ہو جانے کی ذمہ داری ڈال کر میری نظر میں سرخرو نہیں ہو جاؤ گے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی - تنخواہوں میں بے برکتی - رشوت کی گرم بازاری - بیوکریسی کی زیادتیاں - الیکشن کا التوا - آمریت کی طوالت - بے روزگاری کی فراوانی - روز روز پڑنے والے ڈاکے - آخر ان سب کا میری بیماری سے کیا تعلق ہے؟ کیا نظامِ تعلیم ٹھیک ہونے سے میری طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔ دس پانچ روپے کے لیے ہونے والے قتل اگر رک جائیں، تو کیا میں صحت یاب ہو جاؤں گا۔ بند کرو اپنی بکواس اور چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔

وہ اندر ہی اندر کھول رہے تھے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ان بن بلائے مہمانوں کو اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ ان لوگوں سے اپنی بیزاری کا اظہار کرنے کے لیے وہ بار بار کلائی آنکھوں پر رکھتے اور کروٹیں بدلتے رہتے۔ ان کی اس کیفیت کو بیماری کا اضطراب سمجھا گیا۔ ان کے ایک ہم عمر نے ہاتھ بڑھا کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''بخار زیادہ ہے' کوئی جا کر سامنے سے ڈاکٹر وحید کو بلا لائے' مگر ڈاکٹر وحید تو جا چکے ہوں گے۔ ہاں - وہ چورنگی والے ڈاکٹر - بھلا سا نام ہے ان کا - مقصود یا مسعود، وہ ہوں گے' کوئی اُن کو لے آئے - مگر وہ ڈاکٹر صاحب تو بڑے اکل کھرے ہیں - کہیں آتے جاتے ہی نہیں - مریض کا دم ہی نکل جائے' وہ اپنے اصولوں کی حد سے نہیں نکلتے - ایسا کرتے ہیں' ان ہی کو لے چلتے ہیں - پر ان میں اتنی سکت کہاں کہ چورنگی تک بھی چل سکیں - رکشہ والوں کا مزاج بھی اُن کے میٹر کی طرح نہیں ملتا - اتنی سی دور کے لیے کوئی رکشہ ٹیکسی بھی نہیں مل سکتی - ابرار - جا بیٹا - تو اپنی موٹر سائیکل لے آ - انہی کو لے چلتے ہیں''۔ ایک آدمی سے اتنی باتیں سن کر انھوں نے آنکھیں کھولیں اور ساری توانائی یکجا کر کے فیصلہ کن انداز میں کہا:

''مجھے کہیں نہیں جانا''۔

''کہیں نہیں جانا - ؟ یہ بھی خوب رہی - کیا یہیں بستر پہ دم دینا ہے۔ ہمارے ہوتے ہوئے ایسا نہیں ہو سکتا''۔

بھڑوے - مجھے میرے حال پر چھوڑ دے - بولنے والے کی طرف وہ خشمگیں نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔

''بڑھاپے اور بیماری میں آدمی ضدی ہو ہی جاتا ہے۔ جا بیٹا' ابرار' تو اپنی سائیکل لے آ۔ کہنے دے انھیں''۔

خود کو ہمدردی کے نرغے میں گھرا دیکھ کر بے دست و پا ہو جانے کے انداز میں وہ نڈھال سے بستر پر ایسے پڑے رہے جیسے اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیا ہو۔

یہ بڈھا کون ہے؟ اچھا تو یہ کھوسٹ وہ ہے جس نے ساری عمر پوسٹ آفس کی کلرکی کرتے ہوئے گزاری ہے اور اب اپنے تین بیٹوں کی کمائی پر ہر طرف اتراتا پھرتا ہے کہ۔''میں نے اپنے بچوں کو اکلِ حلال پر پالا ہے''۔ ارے تو کیا' ساری دنیا اپنی اولاد کو حرام کھلاتی ہے۔ کیا میں نے نظام کو اپنی محنت کے بل بوتے پر پروان نہیں چڑھایا ہے۔ پھر یہ بڈھا ہر جگہ ٹیچی کیوں بگھارتا رہتا ہے.....اور.....اس وقت۔ ہمدردی کے بھیس میں کیسی دشمنی دکھا رہا ہے۔ ڈاکٹر کی دوا۔ سائیکل۔ جیسے میں نے اس کا باپ مارا ہو۔ میں تو خاموش اپنے اس چھوٹے سے گھر میں پڑا رہتا ہوں۔ کسی سے ملتا جلتا بھی نہیں۔ پھر ان لوگوں کو خبر کیسے ہوگئی؟ میں گیا کبھی کسی کی عیادت کے لیے۔ پھر یہ کیوں آگئے؟ سب بقراط بن رہے ہیں۔ علاج تجویز کر رہے ہیں۔ ارے ناسمجھو۔ بیماری میں سکون کی ضرورت ہوتی ہے اور تم لوگ اپنی باتوں سے۔ اپنی موجودگی سے میرے رہے سہے اوسان کھوئے دے رہے ہو۔ خدا کے لیے اپنی راہ لگو۔ جاؤ جاؤ' اپنے اپنے گھر۔ چھوڑو میرا پنڈ۔

''ارے ابرار: بیٹا' گیا نہیں تو اپنی سائیکل لینے۔ چل' اچھا کیا جو نہیں گیا۔ یہ کھڑکی تو کھول دے۔ جس کتنا ہے۔ ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ ڈاکٹر کے ہاں نہیں جائیں گے۔ تو حال کہہ کے دوا لے آ۔ کہنا۔ بہت تیز بخار ہے۔ کیوں بھئی کھانسی تو نہیں ہے؟ نہیں۔ میرا خیال ہے کھانسی نہیں ہے۔ ہمیں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو گیا ہوگا؟ یہ اب تک تو کھانسے نہیں ہیں۔ بس اتنا کہنا کہ دل بیٹھا جا رہا ہے۔ ہاتھ پیروں میں درد ہے۔ کسی کروٹ چین نہیں ہے۔ بھئی کچھ تو اپنا حال تم بھی بتاؤ یا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں''۔

بڈھے کھوسٹ۔ اپنی بیماری بتا کے میری دوا منگوا رہا ہے۔ خوب واقف ہوں میں' تم لوگوں سے۔ دوسروں کے پھٹے میں ٹانگ اڑانے والو!۔ اپنے اپنے گھروں میں سب کی بولتی بند ہو جاتی ہے۔ جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ کوئی بیوی کے خوف سے' کوئی اولاد کے ڈر سے' اور کوئی حالات کی دہشت سے منہ باندھے ایک کونے میں دن بھر پڑے رہتے ہو۔ اور جہاں دن ڈھلا' سب کے سب چمگادڑوں کی طرح اپنے اپنے گھر سے نکلے۔ چودھری فقیر محمد کی ڈیوڑھی کو فقیر کا تکیہ بنا رکھا ہے۔ جہاں حقے کے کش کھینچتے ہو۔ ایک دوسرے کی غیبت کرتے ہو۔ تم سمجھتے ہو' میں اپنے گھر سے نہیں نکلتا تو مجھے کچھ خبر ہی نہیں ہے۔ تم لوگوں کی رگ رگ سے واقف ہوں میں۔ دنیا جہان پر تبصرہ کرتے ہو' اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے۔ تم بے حوصلہ لوگ حالات سے شاکی ہو مگر ان کے خلاف صف آرا ہونے کی جرأت نہیں رکھتے۔

بڑے میاں کے ذہن میں عیادت کے لیے آنے والوں کے خلاف غصے کے بھبکے اٹھ رہے تھے اور وہ لوگ اُن کے جذبات سے بے خبر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ کبھی اُن کی بیماری کے آئینے میں دیکھتے رہے اور کبھی اپنے حالات کے فریم میں خوش آئند مستقبل کی تصویریں سجاتے رہے۔

جب ڈاکٹر کے ہاں سے دوا آگئی تو ان لوگوں نے اصرار کیا کہ ایک خوراک اُن کے سامنے پی لی جائے۔ مگر بڑے میاں نے کروٹ بدل کے چپ سادھ لی۔

''اچھا۔ تمھاری مرضی۔ مگر یہ دوا پابندی سے پیتے رہنا'

صبح تک ٹھیک ہو جاؤ گے''۔

وہ لوگ تھوڑی دیر اور بیٹھے۔ پھر بڑے میاں کو بیماری کے نتائج اور ڈاکٹر کی مجرب دوا کی خوبیوں سے آگاہ کرنے کے بعد چودھری فقیر محمد کی ڈیوڑھی کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے اٹھ گئے۔

انھوں نے سکون کا سانس لیا۔ پھر ڈاکٹر کے ہاں سے آئی ہوئی دوا کو ایسے گھورا جیسے کوئی دشمن کی طرف دیکھتا ہے۔ یہ دوا ہے یا زہر؟۔

دستی پنکھے کی ڈنڈی دوا کی شیشی کی طرف یوں بڑھائی جیسے ڈرپوک عورتیں مری ہوئی چھپکلی کو پھینکنے کے لیے اس کی طرف جھاڑو بڑھاتی ہیں۔ میز سے گرتے ہی ایک چھناکے سے شیشی چکنا چور ہوگئی اور دوا فرش پر پھیل گئی۔ شیشی کی کرچیاں اور گری ہوئی دوا کو دیکھ کر ان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اپنے جانی دشمن کو ٹھکانے لگا دیا ہو۔ ہونہہ۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ سازش کر کے آئے تھے سب کے سب۔ مجھے سائیکل پر بیٹھا کے لے جاتے اور ڈال آتے کسی بس یا ٹرک کے نیچے۔ جب یہ حربہ ناکام ہوتے دیکھا تو زہر پلانے کی ٹھانی۔ آج پہلی مرتبہ تو بیمار نہیں پڑا ہوں۔ اور بیماری بھی کون سی خاص ہے۔ ذرا سا بخار ہی تو ہوا ہے۔ پیاس کتنی شدید ہے۔ کسی نے ایک گھونٹ پانی کے لیے نہیں پوچھا۔ اور۔ دوا پر کتنا اصرار تھا۔

پانی کا دھیان آتے ہی پیاس کی شدت کے ساتھ خیالات کا پیالا بھرنے لگا۔

نظام کے آنے میں ابھی ذرا دیر ہے۔ عجیب لڑکا ہے۔ روز شام کو آنے کی عادت بنالی ہے۔ عادت۔

ارے اس کے پابندی کے ساتھ آنے کی وجہ سے تو مجھے بھی انتظار کی لت پڑ گئی ہے..... اولاد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ محبت چڑھتی دھوپ کی طرح اپنے آپ دل میں اترتی چلی آتی ہے۔ مگر وہ۔ وہ تو محبت میں نہیں آتا۔ بوڑھے باپ کی خدمت کا جذبہ اُسے نہیں لاتا ہے' اُسے تو لالچ کھینچ کر لاتی ہے۔ کب میری آنکھیں بند ہوں اور وہ جمع جتھ پر ہاتھ صاف کرے۔ شروع میں تو ایسا نہیں تھا۔ شادی کے بعد۔ بیوی کے ساتھ بدلتا چلا گیا۔ اور وہ لڑکی۔ توبہ۔ آفت کی پرکالہ ہے۔ دیکھنے میں کتنی معصوم۔ باتیں کیسی بھولی بھالی۔ مگر لے اڑی میاں کو۔ آخر اس گھر میں نظام کو کیا تکلیف تھی۔؟ گھر چھوٹا سہی پر اپنا تو تھا۔ اب جو کرائے کا مکان لیا ہے' وہ کون سا محل ہے۔ کیسا جی چاہتا تھا کہ اس صحن کی مٹی میں نظام کے بچے کھیلیں۔ پانی۔ ہاں۔ خود ہی اُٹھ کے پی لوں۔ پیاس کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے..... اتنا صبر کیا ہے تو کچھ دیر اور سہی۔ شاید نظام ابھی آ ہی جائے۔ اتنا خیال ہوتا تو جاتا ہی کیوں؟ سوچتا تھا کہ نظام کے بچوں میں طبیعت بہلی رہے گی۔ دادا ٹافی لوں گا۔ دادا آئس کریم کھاؤں گا۔ دادا گڑیا چاہئے۔ پہلا بچہ سال بھر کا بھی نہیں ہوا کہ وہ میرے سارے ارمان بُکل میں مار کے چل دیئے۔ اب ترسو' دادا میاں دو گھونٹ پانی کے لیے۔ اور گنتے رہو' پیاس کے دریا کی موجیں۔ اکیلا ہونا بھی کیسا عذاب ہے۔ سنتی ہو۔ سو گئیں کیا۔ میری سانس ذرا تیز چلے تو نیک بخت اٹھ بیٹھتی تھی۔ وہ ہوتی تو میں اتنا دیر پیاسا رہ سکتا تھا۔ بڑے ارمان پالے بیٹھی تھی۔ مکان کی بنیاد بھی تو اسی کی خواہش پر رکھی تھی۔ دن رات ایک کر دیئے۔ یہ مکان بنایا۔ نظام کو پالا پوسا۔ جب یہ وقت آیا کہ ایک کٹورا پانی کے لیے کہہ سکوں تو وہ چلا گیا۔ مجھے اس سے حاصل بھی کیا کرنا تھا۔ ذرا سا سکون' تھوڑا سا اطمینان' چھوٹی سی خوشی' قربت کی ڈھارس۔ کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ جوان ہوگا تو بڑھاپے کا سہارا بنے گا۔ سہارا تو بس اللہ کی ذات کا ہے۔

''نظام ہماری امیدوں کا واحد سہارا ہے''۔ وہ جنتی کہا کرتی تھی۔ میں سمجھا تا کہ اکلوتی اولاد بڑا دھوکہ ہوتی ہے۔ وہ ہنستی۔

کہتی تھی۔ تھکنے کے بعد تمھارے ذہن میں ایسے ہی خیالات کیوں آتے ہیں۔اب کیسے پوچھوں کہ میں نے جووقت سے پہلے بڑھاپا خریدااور تو نے موت۔آخر کیوں؟ جوانی کی گرمی میں آدمی کبھی کبھی ایک دوسرے سے الگ الگ بھی رہتا ہےلیکن بڑھاپے کی ٹھنڈک میں تو ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کرزندگی بسر کی جاتی ہے ۔رفاقت کے دن آئے تو وہ چل دی۔نظام کی جدائی کے خیال سے دل بیٹھتا ہی چلا گیا۔ایسی پلنگ پر لیٹی کہ اٹھنا نصیب نہیں ہوا۔وہ تو اُٹھ گئی۔اکیلا میں رہ گیا۔اس نظام کے لیے۔اس دن کے لیے کہ وہ بیوی کے کہنے میں آکر ہمیں پوچھے بھی نہیں۔ہم دونوں نے کیا کیا کشٹ نہیں جھیلے۔یہ بات کہوں تو کہہ دے گا وہ تو آپ کا فرض تھا۔ ارے کیا اولاد کو پال پوس کے خود مختار بنا دینا ہی والدین کا فرض ہوتا ہے۔؟ اپنا دھیان ہی نہ رکھیں۔اپنے دن رات۔اپنی ساری توانائی ۔اپنی جان تک ہار جائیں' اس اولاد کے لیے۔صبح سے شام تک بہی کھاتوں پر جھکے جھکے کمر دکھ جاتی تھی۔آنکھوں میں تارے ناچنے لگتے تھے۔پھر بھی سیٹھ مطمئن نہیں ہوتا تھا۔بہت ہی احسان فراموش تھا۔بداخلاق۔یہودی کہیں کا۔لاکھوں روپے کا ہیر پھیر کر لیتا تھا' غلط اندراج کرا کے۔میں تو مجبور تھا۔نوکر تھا۔کیا کرتا۔سارا گناہ اسی کے سر جائے گا۔رسیدیں چھپوا رکھی تھیں۔مسجدوں کو چندہ۔یتیم خانوں کو ہزاروں روپے۔کم بخت۔حکومت کے ساتھ اللہ کو بھی دھوکہ دیتا تھا۔اور میں۔میں تو سب کچھ نظام کے لیے کر رہا تھا۔کیا سیٹھ کے کہنے سے کھاتوں میں غلط اندراج بھی۔؟ ہاں۔وہ بھی۔ لگی بندھی آمدنی ختم نہ ہو۔مکان بن جائے۔نظام بڑا ہو جائے۔ یہی جذبہ تو مجھے بابو غلام حسین کے پاس لے گیا تھا۔تھکا ہارا چراغ جلے سیٹھ کے پاس سے اٹھتا تو بابو غلام حسین کا حساب کتاب لکھنے بیٹھ جاتا۔اچھا ساتھ رہا' بابو غلام حسین کا بھی۔مروت والا آدمی ہے ۔اب بھی کبھی کبھار پوچھنے کے لیے آجاتا ہے۔لوگ ٹیکس دینے سے اتنا گھبراتے ہیں۔؟

''پولیس کیس میں گواہی اور انکم ٹیکس کا چکر۔اللہ دونوں سے بچائے۔'' بابو غلام حسین کہتا تھا کہ اس کے ماموں گواہیاں بھگتاتے بھگتاتے چل بسے تھے اور سسر انکم ٹیکس بلڈنگ کا زینہ چڑھتے اترتے عارضۂ قلب میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہوئے تھے۔اسی لیے وہ ایسا حساب رکھتا تھا کہ ٹیکس لاگو ہی نہ ہو۔اتنا ٹیکس نہیں بنتا تھا جتنا وہ ٹیکس سے بچنے کے لیے خرچ کر دیتا تھا۔میں نے پی ڈبلیو ڈی کی نوکری اسی واسطے چھوڑ دی کہ مجھے رشوت لینا اور دینا بھاتا نہیں تھا ۔تیس برس تک سورج نکلتے تو دیکھا' پر یہ پتا ہی نہ چلا کہ ڈوبتا کب ہے؟ حرام رزق کا ایک بھورا بھی نظام کے پیٹ میں نہیں ڈالا۔پھر وہ اتنا ناخلف کیسے ہو گیا۔ٹھیک ہے بلا ناغہ آتا ہے۔باتوں سے صورت سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس کے دل میں میرے لیے بہت چاہت ہے۔روز ہی اصرار کرتا ہے کہ میں اس کے ساتھ چلوں۔ اس کے ساتھ رہوں۔جب ساتھ رہنا ہی تھا تو یہاں سے کیوں گیا؟ باپ کو ایک ایک بوند کے لیے ترسانے کو۔میں خود ہی اٹھ کے پی لوں۔گلا' سوکھ کر ریگستان ہو گیا ہے۔منہ میں ریت سی بھر گئی ہے۔ کب تک اس کا انتظار کروں؟ کیا پتہ اس کے ہاتھوں مجھے آخری گھونٹ بھی میسر ہوگا یا نہیں۔آثار تو یہی بتاتے ہیں کہ میں اسی دُبدھا میں زندگی کی پگڈنڈی سے گذر جاؤں گا۔

بڑے میاں خیالوں کے انبار میں دبے جا رہے تھے۔

میرے خدا! تو نے مجھے ایک بیٹا دیا وہ بھی اتنا نکما۔ فضول۔ماں اسی حسرت میں گذر گئی کہ بیٹے کی اولاد کو کھلائے گی۔ بہو نے ساس سے جھگڑے کو علیحدگی کی بنیاد بنا دیا اور بیٹے نے جگہ کی قلت کو اور پھر خود غرضی بھی کیسی۔ماں کے بعد یہ بھی نہ پوچھا کہ

ابا! تو دو وقت کا پیٹ کس طرح بھرے گا۔ اس عمر میں اکیلا کیسے رہے گا۔؟ اکیلا تو دنیا میں ہر آدمی ہے۔ اکیلے آدمی کی یہ خواہش بھی عجیب ہے کہ مرنے کے بعد اس کا کوئی نام لیوا رہے۔ نسل چلتی رہے۔ نسل۔ نسل تو جانوروں کی چلتی ہے۔ آدمی کی تو میراث ہوتی ہے۔ میری میراث۔ ایک بیٹا۔ اونھ۔ کبھی بھولے سے بھی ذکر کرتا ہے ماں کا۔ اور ایک وہ تھی۔

''جب اتنی ضد کر رہا ہے تو سائیکل دلا کیوں نہیں دیتے۔؟''

ہمیشہ نظام کی ماں بن کر مجھ سے بات کرتی تھی۔ میں کہتا تھا۔ کبھی تو میری گھر والی بھی بن کے سوچ لیا کرو۔

''تمھارا ابا تو ں کا یہی الٹ پھیر میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا وہ ہمارا بیٹا نہیں ہے۔ پھر وہ اپنی خواہش کہاں' کس کے سامنے بیان کرے؟''

خواہش۔ ہنھ۔ خواہش کے ہاتھوں ہی تو لوگ مرتے رہتے ہیں۔ عرب کا اونٹ ہوتی ہیں یہ خواہشیں۔ ذرا سی جگہ دو تو پھر سب کچھ ان کا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم اپنے سامنے کسی کی نہیں مانتے۔ ایک سائیکل دوسرے ڈاکٹر کی دوا۔ للہی بغض ہے تمھیں ان دونوں سے۔'' ہاں۔ نفرت ہے۔ مجھے نفرت ہے ان سے۔ فاصلے گھٹانے کے چکر میں ہم نے زندگی اور موت کا فاصلہ کم کر لیا ہے۔ تیز رفتاری سے منزل قریب آ گئی ہے اور ڈاکٹر کی دوا جادو کا سا اثر دکھاتی ہے۔ آر یا پار۔ میری اکلوتی بہن۔ ہنستی کھیلتی۔ خود چل کر ڈاکٹر کے پاس گئی اور ہاتھوں پر آئی۔ مانتا ہوں زندگی اور موت انسان کے اختیار میں نہیں' پر احتیاط تو اپنے بس میں ہے۔ لاکھ مجھے دقیانوسی خیالات کا سمجھو۔ لیکن میرے گھر میں کبھی سائیکل کی گھنٹی بجی اور نہ ڈاکٹر کی دوا آئی..... مگر۔ نظام نے تو علیحدہ ہوتے ہی سائیکل خریدی۔ اور اب۔ اب تو اس کے پاس موٹر سائیکل ہے۔ جب آتا ہے تو سکون کا سانس لیتا ہوں اور اُس کے جاتے ہی..... لیکن یہ روز کا پھیرا میری چاہت میں نہیں' لالچ میں ہوتا ہے۔ یہاں پہنچ کر گھر کی تمام چیزوں پر جب وہ حریصانہ نگاہ ڈالتا ہے تو اس بیماری اور نقاہت کے باوجود خون کھول اُٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے دو طمانچے لگا کے اپنی محبت کا صلہ وصول کر لوں۔

بڑے میاں نے لیٹے لیٹے مٹھیاں بھینچ لیں۔ آنکھیں یوں کھول دیں جیسے خیالوں کے دریچے بند کر دیئے ہوں۔ پھر آہستہ آہستہ آنکھیں مندنے اور مٹھیاں کھلنے لگیں۔ پھر بند آنکھوں کے کونوں سے پانی کی بوندیں یوں رسنے لگیں جیسے ان کی بے بسی پگھل پگھل کے بہہ رہی ہو۔

جب وہ جانتا ہے کہ وہی وارث ہے۔ جو کچھ قطرہ قطرہ کر کے جمع کیا ہے اُسی کا ہے تو پھر ایک ایک چیز کے پیچھے کونے کھدروں کی طرف اس طرح کیوں دیکھتا ہے جیسے میری موت کو ڈھونڈ رہا ہو۔ کب میری آنکھ بند ہو اور وہ قبضہ جمائے۔ کبھی میری ضرورت معلوم کرنے کے لیے میری جانب نہیں دیکھا۔ کبھی پوچھا کہ ابا کیا چاہئے۔ ایک گھونٹ پانی..... ایک گھونٹ پانی چاہئے۔ کیا میں کسی تپتے ہوئے ریگستان میں سفر کر رہا ہوں۔ کیا سورج سوا نیزے پر اتر آیا ہے۔ میرے تلوے۔ میری ہتھیلیاں۔ ان میں بھوبل کس نے رکھ دی ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس صحرا سے نکالو۔ میں آواز دوں۔ نظام کو پکاروں۔ پیاس کے مارے زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ میں تو کسی کو بلا بھی نہیں سکتا۔ ارے کوئی میرے خدا کو آواز دے۔

اچانک یہ خیال آیا کہ اگر وہ اسی طرح لیٹے لیٹے کراہتے رہے اور پانی نہیں ملا تو جان کھنچ کے ہونٹوں تک آن پہنچے گی۔ لبوں تک دم آ جانے کے خیال سے وہ ہراساں ہو گئے..... آنکھیں کھول

کر اُس فاصلے کا جائزہ لیا جوان کے اور صراحی کے درمیان تھا۔

پیاسا مر جانے سے تو بہتر ہے کہ پانی.....

اپنی بھرپور طاقت صرف کر کے وہ اُٹھ بیٹھے۔ پلنگ کے سہارے رکھی ہوئی چھڑی اٹھائی اور اپنا تمام بوجھ اُس پہ ڈال کے کھڑے ہو گیے۔ پیاس کے بھنور نے ایک چکر دیا۔ کمزوری نے لمحہ بھر کے لیے آنکھوں میں اندھیرا ابھر دیا مگر وہ جمع کی ہوئی اپنی ہمت کو کھونا نہیں چاہتے تھے' اس لیے ایک ایک قدم کر کے دھیرے دھیرے صراحی کی طرف بڑھتے رہے۔ لرزتے ہاتھوں کٹورے میں پانی انڈیلا اور ڈگڈگا کے پی گیے۔

پیاس کی شدت' خوف کے سائے اور بخار کی تیزی نے جو بے ہمتی پیدا کر دی تھی' پانی پینے کے بعد وہ دور ہوئی۔ پھر قدم قدم چلتے پلنگ پر آ کے لیٹ گیے۔

نظام۔ نظام ابھی تک آیا کیوں نہیں؟ اللہ خیر کرے۔ اکلوتا بچہ ہے۔ کیا ہوا نافرمان ہے تو۔ اُس کے ہونے سے ایک ڈھارس تو ہے۔ کتنا سمجھایا کہ بیٹا موٹر سائیکل ایک شیطانی چرخہ ہے الگ کر دے اسے۔ جب تُو ماں باپ سے الگ ہو سکتا ہے تو اس روگ کو کیوں پال رکھا ہے..... پر سنتا کہاں ہے؟ باغی ہے باغی۔ سمجھتا ہے میں نادان ہوں۔ اُس کے حیلے بہانے نہیں سمجھتا۔ گھر تنگ ہے۔ ارے دل تو کشادہ ہے۔ بات کتنی ذرا سی تھی۔ اس کے بچے کی طبیعت ذرا خراب ہوئی۔ بچے تو ہوتے ہی چھوئی موئی کا پودا ہیں۔ بس وہ لے آیا ڈاکٹر کی دوا۔ اس کا بچہ کیا میرا خون نہیں ہے۔؟ پھر۔ میں اپنی آنکھوں کے سامنے ڈاکٹر کی دوا پلاتے دیکھ سکتا تھا۔ پھینک دی' میں نے شیشی۔ وہ تو ایک لفظ نہیں بولا مگر اس کی بیوی کا پارہ چڑھ گیا۔ اُس ٹوٹی ہوئی شیشی کی کرچیاں میرے چبھ جاتی تو ایسی ٹیس نہ اٹھتی جیسی اُس کی بیوی کی نظروں کے اٹھنے سے پیدا ہوئی۔ اور وہ نیک بخت نظام کی ماں۔ عجیب دودھاری تلوار پہ چل رہی تھی۔ نظام کی بیوی نے مُنہ سے دو لفظ نکالے تو وہ بپھر گئی۔

''بی بی۔ ہم نئے لوگوں کے لیے اپنے پرانے دستور نہیں بدلیں گے۔ اس گھر میں جو کچھ ہوتا آیا ہے' وہی ہوگا''۔

بہو اپنا سا منہ لے کے رہ گئی تو وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔

''بیٹی۔ اللہ تیرا میرا سہاگ سلامت رکھے۔ بڑا فرق ہے دونوں باپ بیٹے میں۔ نظام تیرے کہے میں ہے اور میں اُن کی مرضی کے بنا قدم نہیں اٹھاتی''۔

پھر میری مرضی پوچھے بغیر چلی کیوں گئی۔؟ نظام گھر چھوڑ کے گیا تو وہ مجھ پر برس پڑی۔

''تم نے اُس کو گھر سے نکالا ہے۔ کیا ہوا جو وہ ڈاکٹر کی دوا لے آیا۔ شروع میں تو حکیم جی کی دوا ہی پلائی تھی۔ جب افاقہ نہیں ہوا تو پھر لایا۔ جانتے ہو اولاد کی محبت آدمی کو بے صبر بنا دیتی ہے۔ پھر بھی تم نے اپنے اصول کی خاطر میرا گھر سُونا اور دل ویران کر دیا''۔

اور تو جو میرا گھر سُونا کر کے چلی گئی۔ جب تک زندہ رہی میں دکھوں سے دور رہا۔ جانتا ہوں' نظام کے علیٰحدہ گھر بسانے کا اُسے دکھ تھا۔ بتاشے کی طرح بیٹھتی چلی گئی۔ ایک دفعہ کے سوا کبھی طعنہ بھی نہیں دیا۔ میں اگر بات چھیڑتا بھی تو الٹا مجھے سمجھانے بیٹھ جاتی۔

''جوان اولاد اور آزاد پنچھی۔ مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ تم کیوں دل چھوٹا کرتے ہو؟ نظام آتا تو ہے روز ملنے کے لیے''۔ ہاں۔ روز آتا ہے لیکن ملنے کے لیے نہیں۔ میری سانسیں گننے کے لے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ اب..... پر میں..... میں ابھی نہیں مروں گا۔ میں نے بہت سنبھال سنبھال کے رکھا ہے اپنی زندگی کو۔ ابھی مرنے والا نہیں ہوں میں۔ یہ تو بُخار ہے۔ اُتر جائے گا۔ دوا کی شیشی ٹوٹتے ہی اس کے بیٹے کا بھی بخار جاتا رہا تھا۔ مگر اُس کی نظریں۔ اُف۔ کس

طرح گھورا تھا اُس عورت نے مجھے۔ ہفتے عشرے میں نظام کے ساتھ اب بھی آجاتی ہے۔ بہانہ تو یہ ہے کہ گھر کی صفائی ستھرائی کرانے آئی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ وہ بالکل ہی صفایا کرنا چاہتی ہے۔ نظام کا دل بُرا نہیں ہے۔ وہی ورغلاتی رہتی ہے۔ اُسی نے لاسے پر لگایا ہے..... اپنی مرضی کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھانے دیتی۔ ابھی چار دن پہلے بھی آئی تھی۔ کیسی کیسی پٹیاں پڑھا رہی تھی نظام کو۔

''تم ان کو ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے۔؟''

''تمھیں معلوم ہے کہ ابّا جی نے کبھی ڈاکٹر کی دوا نہیں کھائی۔ پھر یہ بات کہنے کی کیا تُک ہے۔''

''میں تو ان ہی کے بھلے کی کہہ رہی ہوں۔''

''میں ابّا جی کی طبیعت سے واقف ہوں۔ کبھی نہیں مانیں گے۔''

''تم ایک مرتبہ زور دے کر کہو تو۔'' مجھ سے ذرا فاصلے پر یہ سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ دل تو چاہا کہ دونوں کو آڑے ہاتھوں لوں۔ ایسی کھری کھری سناؤں کہ چھٹی کا دودھ یاد آجائے۔ پر خاموش رہا۔ جب میرے گھر۔ میری موجودگی میں وہ نظام کو میری مرضی کے خلاف کام کرنے پر اُکسا سکتی ہے تو اپنے گھر میں کیا کچھ نہیں کہتی ہوگی۔ اور یہ سب کچھ آخر کس لیے۔ چاہتے ہیں کہ مجھ سے جان چھوٹے ..... کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ کسی ایسے شخص کو دے دوں جو میرا احسان تو مانے۔ میرے بعد مجھے یاد تو رکھے۔ ان لوگوں کے دل میں تو لالچ کا بسیرا ہے۔ مگر۔ میرے پاس ہے کیا۔ لے دے کے یہی ایک چھوٹا سا مکان۔ بیوی کا چھوڑا ہوا چند تولے کا زیور اور کچھ روپے۔ مکان کے کاغذ اور بیوی کا زیور تو پرانے صندوق کی نچلی تہہ میں پڑے ہیں۔ اُن کے اوپر پرانے دُھرانے کپڑے اور ٹوٹے پھوٹے برتن یوں ڈال رکھے ہیں کہ کسی کو شبہہ بھی نہیں ہو سکتا۔ رہی نقد رقم تو وہ بنک میں ہے۔ نظام نے بیلنس معلوم کر ہی لیا ہوگا۔ دو ہفتے سے وہی تو چیک لے کر جا رہا ہے۔ مگر کیا فرق پڑتا ہے۔ چیک بک تو میرے پاس ہے۔ انھوں نے کروٹ بدل کر تکیے کے نیچے سے رومال میں لپٹی ہوئی چیک بک نکالی۔ کچھ دیر تک اُسے ہاتھوں میں دبائے رہے۔

یہ خیال اچھا ہے کہ سب کچھ کسی اور کو دے دوں۔ مگر وہ کون ہو؟ رشتہ داروں میں۔ ارے اُن سے اچھے تو غیر ہیں۔ صرف رشتہ رہ گیا ہے، تعلق ختم ہو چکا ہے۔ پوچھا کسی نے اس کسمپرسی کے عالم میں۔ سب اپنے اپنے دَھندوں میں لگے ہیں۔ نفسا نفسی کا زمانہ ہے۔ اور کہتے ہیں زمانہ ترقی کر رہا ہے۔ بے شک ترقی کر رہا ہے۔ خود غرضی اور بے ایمانی میں۔ کج روی اور بد اخلاقی میں۔ زندگی کی تباہ کاری کے لیے نت نئے ہتھیار ایجاد ہو رہے ہیں۔ زمین کو تہس نہس کرنے کے منصوبے۔ زہرہ اور مریخ پر کمند پھینکنے کی تدبیریں۔ یہ ترقی ہے۔ یہ ترقی ہے کہ بیٹا باپ کی زندگی پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے۔ نظام کو تو میں کچھ نہیں دوں گا۔ اس لالچی کو تو سزا دینی ہے۔ ایک پرچہ لکھ دوں کہ میری زندگی کا حاصل ایک بیٹا اور ایک مکان۔ بیٹا بہو کو دے دیا اور مکان کسی بھی ضرورت مند کو۔ نظام کی بیوی یہ سنے گی تو کس قدر جھلائے گی۔ بڑا لطف رہے گا۔ لیکن۔ لیکن میں۔ یہ ترکے اور ورثے کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے ذرا سا بخار ہی تو ہوا ہے۔ اس سے پہلے میں کتنی شدید بیماریاں جھیل چکا ہوں۔ مجھ میں ابھی زندہ رہنے کی اُمنگ بھی ہے اور حوصلہ بھی۔ میں ابھی زندہ رہوں گا۔ ابھی زندہ رہوں گا۔

بڑے میاں تیز بخار کی غنودگی میں جھونکا کھا گیے۔ آنکھ اُس شور سے کھلی جو موٹر سائیکل کو بند کرنے سے پہلے ریس دینے پر اٹھتا ہے۔

آ گیا۔ سب سے پہلے تو میں کہوں گا' مجھے پانی پلائے۔

پھر آج اس سے یہ بھی کہوں گا کہ اس پھٹ پھٹی کو بیچ دے۔ جب تک آنہیں جاتا ہے دل سے ہزار وسواس گذرتے رہتے ہیں۔

''ابا جی ! کیسی طبیعت ہے؟'' اپنا یہ ٹھنڈا ہاتھ میری پیشانی سے نہ ہٹانا۔ اسی لہجے اور اسی لمس کے لیے تو ترستا رہا ہوں۔

''ابا جی ! مجھے معلوم ہے آپ کو زندگی سے پیار ہے''۔

مجھے تجھ سے بھی پیار ہے بیٹے۔ میں نے تیری آسانیوں کی خاطر بڑی مشکلیں سہی ہیں۔

''آپ نے اسی پیار کی خاطر کبھی ڈاکٹر کی دوا نہیں لی۔ کبھی سائیکل پر سواری نہیں کی مگر.....''

ڈاکٹر کی دوا سے تجھے بھی دور رکھا ہے بیٹا۔ سائیکل' تو نے الگ گھر بسانے کے بعد ہی خریدی ہے۔ لیکن آج تیرے لہجے میں اتنی مٹھاس۔ اتنی چاہت کیوں ہے۔؟

''۔ ابا جی ۔ اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ آپ کی حالت کا سوچ کر مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی ہے۔ دن کو دفتر میں جی نہیں لگتا ہے۔ ہر لحہ دھیان آپ ہی کی طرف لگا رہتا ہے۔''

یہ میں کن فضاؤں میں اُڑنے لگا ۔ اپنا ہاتھ مجھے دے۔

ہاں ۔ ہاں میں بھی تو یہاں دن رات اکیلا پڑا تیرے ہی بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ تیری سلامتی کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ اور جب تو آتا ہے تو۔ تجھے نظروں میں اتارنے کے بعد آنکھیں بند کر لیتا ہوں۔ کچھ نہیں کہتا اور تیری سنتا رہتا ہوں۔

''ابا جی۔ ماں باپ کو اولاد بہت عزیز ہوتی ہے۔''

یہ مجھے کیوں سنا رہا ہے۔ کیا میری تنہائی کا سبب نہیں جانتا۔ تُو نے الگ گھر کیا بسایا کہ تیری ماں نے قبرستان آباد کیا۔

''۔ میں اپنے بچوں کو ڈاکٹر کی دوا پلاتا ہوں۔ اور دیکھیے دو چار دن ہی میں ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ بہت سے ڈاکٹروں کے ہاتھ میں اللہ نے شفا دی ہے۔ تو بس۔ آج میں آپ کی ایک نہیں سنوں گا ۔ بہت رہ لیے آپ اکیلے۔ اب مجھ سے آپ کے بغیر نہیں رہا جاتا۔''

پھر یہاں کیوں نہیں آجاتا۔ اس ڈھنڈار گھر میں تیرے آنے سے رونق آجائے گی۔ بچوں کی ہنسی گونجے گی تو میری بیماری بھی رفو چکر ہو جائیگی۔

''کلثوم چاہتی ہے کہ وہ آپ کی خدمت کرے۔ یہاں دو چار دن رہ کر نہیں بلکہ آپ کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھ کر۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے۔ پھر میرے دفتر سے بھی دور ہے۔ اور پھر.....؟''

آج یہ مکان چھوٹا ہو گیا۔ دفتر سے دور ہو گیا۔ ہزار خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ سیدھی سی بات یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہاں روک ٹوک کرنے کے لیے میں موجود ہوں۔ تو اب مجھے لے جا کے اپنی آزادی میں خلل کیوں ڈالنا چاہتا ہے؟ دیکھ تیری قربت پانے کے بعد تو میں' اپنی پیاس کو بھول گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تو اسی طرح میرے پاس رہے۔ ایسی ہی باتیں کرتا رہے۔

''۔ ابا جی۔ ماں باپ کا اولاد پر بڑا حق ہوتا ہے۔ لیکن کچھ حق اولاد کا بھی ہوتا ہے۔ آج میں آپ کی کوئی بات نہیں مانوں گا ۔ آپ بخار میں بھک رہے ہیں۔ آج میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ ہرگز اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں نے کبھی آپ سے ضد نہیں کی۔ جو کچھ آپ نے کہا' میں نے مانا۔ لیکن آج۔ آج میں اپنی بات منوا کے رہوں گا۔ مجھے بھی آپ سے محبت ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ آپ کی شفقت کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر رہے۔ اٹھیے۔ میرے ساتھ چلیے۔ راستے میں ڈاکٹر صاحب کو بھی دکھا دیں گے۔''

جھٹکے کھاتے ہوئے بڑے میاں سوچ رہے تھے۔ لالچی نظام ہے یا میں ہوں ۔ میں ۔ جو کمبل میں لپٹا اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا ڈاکٹر سے دوا لینے جا رہا ہوں۔

(افسانہ)

لہو پکارے

شبیب احمد کاف مرحوم

آج وہ اپنی پانچ ماہ کی حاملہ بیوی کو لے کر نئے گھر میں آ گیا تھا۔ دو کمروں اور مطبخ پر مشتمل اس مکان کی نئی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی کالونی تھی جس میں کل چونسٹھ گھر بنائے گئے تھے۔ کرائے داروں کے لیے قرعہ اندازی میں اس کا نام آ گیا تھا۔ اور راتوں رات وہ اپنے والدین کے گھر سے کپڑے لتّے اور مختصر سامان لے کر یہاں آ گیا تھا۔

''کیسا ہے گھر۔؟'' اپنی بیوی سے اُس نے پوچھا۔''

اچھا ہے۔'' مختصر جواب تھا اس کی بیوی کا۔ وہ جانتا تھا کہ سیدھی سادی اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سسرال سے علیٰحدگی پر اس سے نالاں ہے۔ وہ کہتی تھی کہ ساس ماں کے برابر ہوتی ہے۔ ماں سے ناراضی۔ باپ کی دل دکھائی اللہ کی ناراضی ہے۔ اور یہ کہ شرعی حدود کے اندر رہ کر ماں باپ کا ہر حکم ماننا اولاد پر فرض ہے۔ وہ اس کی ہر دلیل ہر تاویل پر چپ ہو جاتا۔ بحث نہیں کرتا، کیونکہ وہ قرآن وحدیث کے ہی حوالے دیا کرتی۔ بچپن سے ہی اس کی تربیت یوں ہوئی تھی کہ ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام سامنے رکھے جائیں۔ وہ ہر مسئلے کا حل قرآن میں ڈھونڈتی۔ حدیثوں میں کھنگالتی۔

کبھی اُسے غصہ آ جاتا تو کہتا۔'' کچھ بھی ہو زلیخا۔ ہمیں اجتہاد کا موقع بھی دیا گیا ہے۔ کوئی ایسا حل ڈھونڈنا چاہئے، جس سے طرفین کا دل کم دکھے۔''

اب یہ اجتہاد والی بات زلیخا کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اور یوں اُسے گھر بدلنے والی بات ماننی ہی پڑی تھی۔ پچھلی رات دونوں نے جاگ کر گزاری تھی۔ زلیخا نے ہر حربہ آزما لیا۔ ہر داؤ لگایا۔ لیکن شوہر کے آگے ایک نہ چلی۔ محسن جما رہا کہ صبح گھر بدلنا ہے اور اگر وہ آنا نہیں چاہتی تو رہ جائے۔ یہیں ہفتے میں دو یا تین بار آ کر اسے دیکھ جائے گا۔ زلیخا تڑپ کر اٹھی اور سامان باندھنے لگی تھی۔ دس ماہ کی بیاہی کون جنم جلی شوہر سے الگ رہنا چاہے گی۔ وہ بھی اس وقت جب کہ کوکھ میں بچہ ہاتھ پیر بنا رہا ہو۔ تین گھنٹوں میں سارا سامان باندھ کر فجر کی اذان سے پہلے وہ گھر چھوڑ چکے تھے۔ زلیخا نے ساس سسر کو جگا کر اطلاع دینے کو کہا۔ لیکن محسن نے کچھ ایسی نظروں سے گھورا کہ اس کے ہاتھ پیر پھول گیے۔ اور اس نے چپ چاپ برقعے کی اوڑھنی سر پر ڈال لی۔ آنسوؤں کو اندر ہی دبایا کہ کیا پتہ آنسوؤں کو دیکھ کر محسن اس کا گلا ہی نہ دبا دے۔ ہاں اوڑھنی سر پر پڑتے ہی آنسوؤں کو باہر آنے کا موقع مل گیا تھا۔ اور وہ چپکے چپکے رو لی تھی۔

محسن کو اپنے والدین سے شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔ وہ شکایتوں کے پلندے یوں کھولتا کہ بچپن ہی سے اس کے والد ماجد جو خودسر، ضدی اور جھٹ خفا ہونے والی شخصیت تھے، اپنے باپ سے ملنے والے کاروبار کو اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر چھ مہینوں میں ختم کر ڈالا۔ اور چاروں بھائی ایک سال میں شہر کے

کنگالوں میں شمار ہونے لگے تھے۔اپنے تجربے اور بچی ساکھ کے سہارے محسن کے والد نے کچھ پیر جمائے اور اس حد تک کامیاب ہوئے کہ پانچ بچوں کا جینا چل جاتا۔محسن کا کہنا تھا کہ دادا محترم کا کاروبار ٹھپ نہ ہوا ہوتا اگر اس کے والد ظہیر صاحب کا غصہ آڑے نہ آتا۔ہوا یہ کہ ان کے ایک بھائی نے مشترکہ کاروبار میں اپنا حصہ مانگا اور اُنھوں نے فوراً ہی اس کا حصہ الگ کر ڈالا تھا۔ چند روز بعد دوسرے بھائی نے ہاتھ پیر نکالے اور ظہیر صاحب نے اس کا حصہ بھی دے دیا۔اور ساتھ میں اس بھائی کا حصہ بھی جس نے حصہ نہیں مانگا تھا۔ جمے جمائے کاروبار سے ایک بڑی رقم نکال لو تو فرق پڑتا ہے۔سال دو سال اسے سنبھلنے میں لگ ہی جاتے ہیں۔ پہلے بھائی کا حصہ الگ کرنے کے بعد دوسرے اور تیسرے اور چوتھے بھائی اور ان کی ہٹ نے ایک کاروبار کو اپنے محور سے ہٹایا تو اپنی گردش ہی بھول گیا۔جو بھائی اپنے حصص لے کر الگ ہوئے تھے،انھیں ناتجربہ کاری اور موقع پرستوں کی بھیڑ نے عین سڑک پر لا کھڑا کیا۔ ادھر ظہیر صاحب بھی اپنے لڑکھڑاتے قدموں کو جما نہ سکے۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے ان کا فرض یہ تھا کہ کم عقل اور چھوٹے بھائیوں کو سمجھاتے،انھیں دباتے اور سب کی آن قائم رکھتے۔اب صرف غصے کی بنیاد پر کوئی سولی نہیں چڑھ جائے گا کہ چھوٹے بھائی نے ایسا کہا تھا۔

اور اس کے بعد ظہیر صاحب جو بکھرے تھے تو پچپن سال کے ہونے کو آئے،خود کو سمیٹ نہ سکے تھے۔ اِدھر اُن کی بیوی جس نے اپنی شادی کے پہلے چند سال رانیوں اور ملکاؤں جیسی زندگی گذاری تھی،جس کی ہر خواہش ہونٹوں پر آنے سے پہلے پوری ہو جاتی تھی۔گھر میں سات آٹھ نوکرانیاں رہتی تھیں۔ سب چھوٹا تو اس کے دماغ نے بھی جسم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ چڑچڑی رہنے لگیں۔شوہر کو بھی کاٹ کھانے کو دوڑتیں۔بچوں کو بھی رشتے داروں کو بھی۔غیروں کو بھی اپنوں کو بھی۔

رشتے داروں نے آنا چھوڑا۔ غیروں نے کان پکڑے۔ بچے والدین سے سہمے سہمے رہنے لگے۔گھر میں سناٹا ہوتا،سب اسکولوں سے آتے اور اپنی جگہ لے لیتے۔نہ کسی سے کچھ کہنا نہ سُننا۔اس ماحول میں محسن نے سانسیں لیں۔بڑا ہوا۔ گریجویشن کیا۔پھر بھی باہر کی دنیا میں گھل مل نہ سکا۔جو خاموشی اس کی گھٹی میں پڑ گئی تھی،اس نے اسے باہر کی دنیا میں بھی اپنی زبان بند رکھنے پر مجبور کیا۔

والدین سے اختلاف کی پہلی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے دوستوں،رشتے داروں سے الگ رکھا اور ایک بے زبان جانور بنا کر چھوڑا۔

محسن نے گریجویشن کے بعد ایک مقامی ٹیانری میں ملازمت کر لی۔شام کے پانچ بجے کے بعد بھی وہ کام کرتا رہتا۔کبھی دس کبھی گیارہ بجے رات تک۔گھر جا کے کرنا بھی کیا تھا۔ دیواریں تکنا یا دروازوں دریچوں سے آنکھ مچولی کھیلنا۔رات گیے وہ گھر جاتا۔کھانا کھا لیتا۔سو جاتا اور صبح اپنے کام پر واپس۔دوست اس نے کبھی بنائے نہ تھے یا بنے نہیں تھے۔اس کی لگن،محنت اور سادہ صفت دیکھ کر ٹیانری کے مالکوں نے کمپنی کے خرچ پر اسے اٹلی بھیج دیا۔ جہاں اس نے دو سال فٹ ویر ٹیکنالوجی کا کورس کیا۔اس کے واپس آنے تک ایک شو یونٹ شروع ہو چکی تھی۔

اٹلی سے واپسی پر اسے چیف ٹیکنیشین کا عہدہ دیا گیا اور تنخواہ ایک ہزار سے چار ہزار کر دی گئی اور محسن کے والدین کے دن پھر گیے۔ ماں اور باپ دونوں انگڑائیاں لے کر اٹھے۔

دونوں نے اپنے بیٹے پر حق جتانا شروع کر دیا۔ باپ کا حکم ہوا کہ محسن تنخواہ اس کے پاس دے۔ بھولے بھالے محسن نے یہی کیا۔ لیکن جب سلیقے کے کپڑوں اور جیب خرچ کے لیے بھی اسے تکلیف ہونے لگی تو اس نے ہر ماہ ایک ہزار روپے روک لیے۔ اس پر ماں اور باپ دونوں نے وہ اودھم مچایا کہ اس کے ہوش ہی گم ہو گیے۔

''چھنالوں پر خرچہ کرے گا کیا؟'' اس کی ماں بولی تھیں۔ محسن ٹوپی اوڑھ کر سیدھا مسجد پہنچ گیا۔

ظہیر صاحب نے پھر یہ بھی کیا کہ سیدھے شو یونٹ پہنچ گیے اور کہنے لگے کہ محسن کی تنخواہ اس کے حوالے نہ کی جائے۔ وہ خود آ کر لے جائیں گے۔ لیکن انھیں کھرا جواب ملا کہ وہ یہاں آنے کی زحمت نہ کریں۔ کمپنی اپنے اصولوں کی پابند ہے۔

چند دن گذرے تو محسن نے شادی کی بات چھیڑ دی۔ لیکن ان کے والدین پیسے بنانے والی اس مشین کو اتنی جلدی کسی اور کے حوالے کرنے پر راضی نہ تھے۔ پورے چار سال انھوں نے اس مشین سے فائدہ اٹھایا اور دنیا والوں کی زبان بند کرنے کو بتیس سال کی عمر میں اس کی شادی کی۔

نکاح کے دوسرے مہینے سے محسن نے مزید ایک ہزار روپے اپنے پاس رکھ لیے۔ نکاح کے بعد کمپنی نے اس کی تنخواہ میں پانچ سو روپوں کا اضافہ کیا تھا۔ اور شادی کے موقع پر اسے بطور تحفہ پچیس ہزار روپے کمپنی سے ملے تھے۔ محسن نے تنخواہ میں اضافے اور تحفے والی بات والدین سے چھپائے رکھی۔ لیکن ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں' اس کے ماں باپ نے آسمان کے ساتھ سورج اور ستاروں کو بھی سر پر اٹھا لیا۔

ماں کہہ رہی تھیں ''سمجھتا کیا ہے؟ نو مہینے تجھے پیٹ میں جو رکھا تھا۔ لاکھوں روپے بھی اس کا بدل نہیں ہیں۔''

اس رنڈی کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔''

محسن جوائلی میں رہ کر دنیا خوب سمجھ چکا تھا۔ بیوی کے سامنے ماں باپ کا یہ ہلّو برداشت نہ کر سکا اور زندگی میں پہلی بار اس نے منہ کھولا تو ایسا کہ عالم دنگ رہ گیا۔

''پیٹ میں رکھا تو مجھ پر کون سا احسان کیا۔ کرتوت آپ دونوں کے تھے۔''

''اگر میری بیوی رنڈی ہے تو.....'' محسن نے زبان روک لی تھی۔

ظہیر صاحب کو ایسے جوابات کی توقع کہاں تھی۔ پاس پڑا جوتا اٹھایا اور تڑا تڑ محسن کے سر پر مارتے گیے۔ اس کی بیوی کے سامنے ہی۔ محسن جو غصے میں ہوش کھو بیٹھا تھا، سمجھ گیا کہ کتنی بڑی بات اس نے ماں کی شان میں کہی۔ ویسے اس کا جی تو چاہا کہ مارتے باپ کا ہاتھ روک لے لیکن.....ابھی ماں کو اس نے جو سنائی تھی اس کے ملال نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ چپ چاپ کمرے میں واپس آیا اور بیوی کے سینے سے سر لگا کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''زلیخا۔ یہ اذیت میں بیس سالوں سے سہتا آ رہا ہوں۔ دونوں میرا گلا گھونٹتے نہیں، مجھے سسکا سسکا کر مارتے ہیں۔ اب تک یہ اذیتیں میں نے اکیلے سہی ہیں۔ سوچتا ہوں تمھاری آمد کے بعد ان کی حرکتیں کم ہو جائیں گی۔ لیکن میں کیا کروں..... گلا دبا دو تم میرا۔'' پھر وہ زلیخا کے دونوں ہاتھ اپنی گردن کے گرد کس کر انھیں دبانے لگا۔

زلیخا آہستگی سے اپنے ہاتھوں کو محسن کی گردن سے

ہٹاتی ہوئی دھیرے دھیرے اُس کی پیٹھ کے گرد لے گئی۔ اور اسے بھینچ لیا۔

''صبر کیجیے۔ کتنا بڑا درجہ ہے صابروں کا۔'' وہ اتنا ہی کہہ سکی تھی۔ کیونکہ جو ذہنی اذیت اسے بھی اپنے شوہر کو جُوتے سے مار کھاتے دیکھ کر ہوئی تھی، اس نے اس کی آواز بھرا دی تھی۔

اس وقت محسن نے فیصلہ کیا کہ اسے علیٰحدہ ہو جانا ہے۔ ورنہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔ اب ان کی باتوں کے جوابات دے کر خود کو گنہگار بنانا نہیں چاہتا تھا۔

انھیں دنوں غزل اپارٹمنٹس کی تعمیر ہو رہی تھی۔ قرعہ میں اپنا نام اس نے لکھوایا تھا۔ نام آ گیا تو وہ وہاں آ گیا تھا۔

دوسری شام ہی محسن کے والدین نئے گھر میں آندھی اور طوفان کی شکل میں وارد ہوئے۔ لیکن محسن کے چہرے کی کرختگی اور بدلی آنکھوں کے رنگ نے ظہیر صاحب کو چونکا دیا۔ وہ سنبھل گیے پر محسن کی اماں ہذیان بکتی گئیں۔ اب کی انھوں نے بہو پر سارا غصہ اتارا۔

آج کی لڑکیاں جوان ہوتے ہی اس بات کا فیصلہ کرتی ہیں کہ شادی کے بعد جتنی جلدی ہو سکے شوہر کو بھگا لے جائیں گی۔

جان لو ، بیٹے کی جدائی ماں کا کلیجہ پیس ڈالتی ہے۔ باپ کا دل مار دیتی ہے۔ تم بھی تڑپو گی زلیخا۔ تمھارے بیٹے بھی اپنی بیویوں کے ساتھ بھاگیں گے۔

تم روؤ گی ، اکیلی رہو گی۔

تمھیں گیارہ لڑکے ہوں گے اور سب اپنی جوروؤں کے ساتھ الگ ہوں گے۔

تب ..... محسن بھی نہیں ہوگا دنیا میں۔ تم بوڑھی بنی مجھے یاد کرو گی۔ لٹکے ہاتھ پیر اور لٹکے چمڑے کے ساتھ۔

زلیخا کانپتی ہوئی ساس کے کوسنے سنتی رہی تھی۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اور جب ساس کی زبان چلتی ہی رہی تو وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ دھم سے فرش پر بیٹھ گئی اور دھائیں دھائیں رونے لگی۔ محسن نے بیوی کو دیکھا۔ شوہر کو بیوی کے آنسو کب برداشت ہوتے ہیں۔ اس نے چپ چاپ ماں کا ہاتھ پکڑا۔ اُسے کھینچتا ہوا گھر سے باہر لایا اور سرد آواز میں بولا۔'' اس سے پہلے کہ میں کچھ ایسا کروں جو مجھے نہیں کرنا چاہئے، یہاں سے چلی جاؤ ماں''۔

ظہیر صاحب پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ اُنھوں نے محسن کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا۔ انھوں نے بیوی کا ہاتھ تھاما اور وہاں سے چل دیئے۔

اس واقعے کے بعد زلیخا مسلسل تین دن تک روتی رہی تھی۔ محسن اسے تسلیاں دیتا رہا۔ پر اس کی آنسوؤں کی جھڑی لگی رہی۔ ہچکیوں کے درمیان بولتی۔

''اماں مجھے کچھ کہتیں۔ لاکھ کوستیں۔ میں سُن لیتی۔ سہہ لیتی۔ لیکن میری اولاد کو انھوں نے گالیاں دیں۔ یہ انھوں نے اچھا نہیں کیا۔''

محسن نے کہا۔'' صرف ایک بار کے کوسنوں سے تم اُکھڑ گئیں زلیخا۔ اتنے سالوں سے میں نے کیا کیا نہ سنا۔ کیسی حالت رہی ہوگی میری۔ نہ کہیں جا سکتا، نہ کسی سے کچھ کہہ سکتا، اکیلا میں سُنتا رہا۔ دل پتھر کا کر لیا۔ دماغ کے کل پرزوں کو جام کر دیا تھا۔ کیونکہ مجھے جینا تھا، زندہ رہنا تھا۔''

''تم نہیں جانتیں زلیخا۔ جب میں ٹیانری میں ملازم تھا تو ہزار روپے کی تنخواہ ساری کی ساری اُن کے حوالے کرتا تھا۔

تب بھی وہ مجھے اپنے رشتے داروں میں بدنام کرتی تھیں کہ ایک روپیہ نہیں دیتا۔ جب شو یونٹ میں چار ہزار روپے تنخواہ ہوئی تو کہتی پھریں کہ صرف پانچ سو روپے دیتا ہوں، جب کہ ساری ہی رقم حوالے کرنے کے پندرہ سولہ دنوں بعد کوئی رسید وہ میرے حوالے کرتیں۔ رہن میں کوئی زیور رکھا ہوا ہوتا۔ مجھے یہ چھڑانا ہوتا۔ کسی بھی طور۔ ورنہ کچھ بھی سننے کو تیار رہنا ہوتا۔

چند دن گذرتے کسی رشتہ دار کا خط آتا کہ دو سال قبل والدِ محترم نے تین سو روپے جو قرض لیے تھے وہ اب تک لوٹائے نہیں ہیں۔ یہ خط میرے ہاتھوں میں تھما دیا جاتا۔ بغیر کسی پیش لفظ کے۔ اور غیرت کا مارا میں تھوڑا تھوڑا کر کے یہ رقم قرض دار کو بھیجتا۔

یہ ہیں زلیخا میرے ماں باپ۔ کبھی خیال ہوتا کہ شاید میں ان کا بیٹا نہیں ہوں۔ تکلیفیں ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ سب کو مل بیٹھ کر اسے دور کرنا ہوتا ہے نا؟ لیکن ان کا یہ طور۔ ان کا طریقہ۔ پتہ نہیں اپنی ہی اولاد سے انھیں اتنا بغض کیوں ہے۔ ایک سوال زلیخا۔ جس کا جواب شاید مجھے کبھی نہیں ملے گا۔ بس ایک بات سے تھوڑی تسلی ہوئی کہ میری نانی بھی ہو بہو میری ماں کی طرح تھیں۔ صورت میں بھی سیرت میں بھی۔ نانا بیچارے اللہ والے تھے۔ جلد ہی اللہ کے پاس چلے گیے۔ لیکن ہمارے والدِ محترم۔ دنیا دیکھی ہے نا انھوں نے۔ پس بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں۔

کتنی ہی آزمائشیں ہیں زلیخا۔ شاید اس طرح میری آزمائش ہو رہی ہے۔

للہ زلیخا۔ آج جو ٹارچر تم پر میری ماں نے کیا ہے اس کے لیے میں شرمسار ہوں۔ میں معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ آج کے بعد ایسا کوئی موقع نہیں آئے گا۔ ہم اطمینان سے رہیں گے۔ پُرسکون زندگی گزاریں گے زلیخا۔ میں، تم اور یہ بچہ جو چند مہینوں بعد ہمارے ساتھ ہوگا۔''

زلیخا اپنے مجازی خدا کی جانب دیکھتی رہی، جس کے چہرے سے معصومیت ٹپکے جا رہی تھی۔ فرشتوں کا تقدس چھلک رہا تھا۔ انگ انگ سے پاکیزگی پھوٹی جا رہی تھی۔ اتنی تفصیلات سے وہ واقف نہ تھی، جو ابھی محسن نے سنائیں۔ وہ اپنا دُکھ بھول گئی۔ اپنا سر اس نے محسن کے شانے سے ٹکا دیا۔ اور دھیرے سے بولی۔

''ایسا ہی ہوگا! آپ معافی مت مانگیے۔ مجھے بھی ان کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے۔''

محسن نے شکر گزار نظروں سے زلیخا کو دیکھا اور اُس کی پیشانی چوم لی۔

ایک خوبصورت لڑکا زلیخا کو تولد ہوا۔ محسن نے اپنے ماں باپ کو اطلاع نہیں کی۔ نام رکھائی کا موقع آیا۔ زلیخا نے کئی نام چنے۔ ابراہیم، یوسف، اسحاق، یعقوب، حنیف، ملک، نصیر، منیر، انور، کمال، غنی، رحیم، بشیر، سلیم، سمیع، مسعود، عمران، ثنا۔

لیکن کئی دنوں کے غور و فکر کے بعد محسن نے چار ناموں کا انتخاب کیا۔ ''قدیر۔ بشیر۔ منیر۔ بصیر۔''

زلیخا نے احتجاج کیا کہ ان ناموں میں کوئی چارم نہیں ہے۔

لیکن محسن نے کہا کہ ان ہی میں سے کوئی ایک رکھا جائے۔

''پر کیوں؟'' زلیخا متحیر تھی۔

''ظہیر کے وزن میں یہی نام آ رہے ہیں۔'' دھیرے سے محسن نے کہا اور زلیخا منہ کھولے اسے دیکھتی رہ گئی۔